ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

نگار

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا،

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸ ؍ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۳۸) | فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۴۰ء | شمار (۲)

ملاحظات — قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے — ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان ---------- ۲
عربوں کی سیاسی بیداری ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۹
ریڈیو کے آس پاس ---------- (پروفیسر) رشید احمد صدیقی ایم۔ اے ---------- ۲۵
مرزا ابوالحسن آصف خاں ---------- کوثر چاندپوری ---------- ۳۰
سیفو ---------- ل۔ احمد اکبرآبادی۔ (اخذ و اقتباس از ہندستانی) ---------- ۴۱
کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟ ---------- امام۔ اکبرآبادی ---------- ۵۵
نیاز کی آزاد خیالی ---------- محمد عبدالشکور فکر ندوی ---------- ۵۸
باب الاستفسار (لوحِ محفوظ اور عذاب و ثواب) ---------- ۶۱
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۵
دُنیا میں صرف ایک مُلحد ہے اور ایک مسلمان! ---------- ۷۱
منظومات ---------- ماہر القادری۔ طفیل احمد خاں۔ فضل الدین اثر۔ خلیل اللہ قریشی ---------- ۷۷

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ - ۲	اگست سنہ ۶۰ء	جلد - ۳۸

ملاحظات

قرآن کا کلامِ خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے

یہ ہے اصل بحث جو میرے اور ہندوستان کے بعض مولویوں کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن انسانی کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے اور اس کے ثبوت میں وہ "وحی یوحیٰ" اور "لوحِ محفوظ" والی آیات کو پیش کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ قرآن کا وحی ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے اور "لوح محفوظ" کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی میرے نزدیک درست نہیں (ملاحظہ ہو نگار جولائی سنہ ۶۰ء) - اس پر مجھے جتنی گالیاں مولویوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے (جو اُن کے پروپاگنڈا کے زیر اثر ہیں) دیجا سکتی تھیں، مل چکی ہیں اور مل رہی ہیں، لیکن مجھے یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ جو دلایل میں نے اس عقیدہ کی تردید میں پیش کئے ہیں ان کا بھی جواب کسی نے دیا یا نہیں - میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سُنا ہے کہ شاید اخبار زمزم میں دارالمصنفین کے کسی رفیق نے کوئی جواب شایع کیا ہے اور اخبار حق میں بھی کسی مولوی صاحب نے خامہ فرسائی کی ہے - بہرحال یہ دونوں مضامین میرے سامنے نہیں ہیں - اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا ہے اور وہ میرے لئے باعثِ تسکین ہو سکتے ہیں یا نہیں -

ان لوگوں کی طرف سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میری تردید میں لکھتے ہیں وہ میرے پاس نہیں بھیجتے حالانکہ اُصولاً اسے نگار ہی میں شایع ہونا چاہئے، تاکہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں میں جو گمراہی میرے مضامین سے پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو سکے۔ اس کے علاوہ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ میرے شبہات ہوتے ہیں عقل کی بنا پر یا پھر استشہادِ قرآنی پر، اور وہ جواب دیتے ہیں روایات سے۔ یعنی اگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلاں بات فلاں عقلی دلیل کی بنا، پر یا فلاں آیت کی رو سے قابل قبول نہیں، تو وہ اس دلیل کی تردید تو کرتے نہیں بلکہ صرف احادیث وتفاسیر، اور اقوال اکابر سلف پیش کر دیتے ہیں یعنی ایک طرف وہ مجھے مرتد، ملحد و کافر بھی کہتے جاتے ہیں اور دوسری طرف دلیلیں پیش کرتے ہیں وہ جو ایک مسلمان ہی کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک مولوی صاحب نے تو جواب میں یہانتک لکھدیا کہ "قرآن کو تو خدا کا کلام کفار قریش نے بھی مان لیا تھا"۔ یہ سنکر مجھے بہت ہنسی آئی۔ اگر وہ مجھے ملتے تو میں انکو صرف یہ جواب دیتا کہ "مولانا بحمد اللہ میں کفار قریش میں سے نہیں ہوں، اور نہ کفار قریش کو اتنی اہمیت دیتا ہوں کہ اُن کا کسی بات کو مان لینا میرے لئے دلیل ہو سکے"۔

میں نے عبد الماجد صاحب دریابادی کو بھی لکھا تھا (جو اسوقت اسلامی دنیا کے تنہا محتسب ہیں) کہ نگار کے صفحات، اُن کی گالیوں کے لئے کُھلے ہوئے ہیں، (کیونکہ سوائے گالیاں دینے کے انھیں اور آتا ہی کیا ہے) میں اُنکے ہر ہر لفظ کو بجنسہٖ شایع کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں عقاید میں کیوں کسی کی تقلید کروں اور مجھے کیوں اس پر مجبور کیا جائے کہ میں اسلام کا مطالعہ دوسروں کی نگاہ سے کروں۔ جس طرح عبد الماجد دریابادی۔ سید سلیمان ندوی۔ مناظر احسن گیلانی یا دوسرے مولویوں کو اسلام کے سمجھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مجھے بھی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں میں بھی اسلام کی خدمت کر سکتا ہوں اور جس طرح وہ میرے عقیدہ کو الحاد و ارتداد سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے اقوال کو لغو و مہمل قرار دے سکتا ہوں۔ قرآن شریف ان کے سامنے بھی ہے، میرے سامنے بھی جس طرح انھیں تفکر وتدبر کی دعوت دی گئی ہے، مجھے بھی دیگئی ہے، لیکن اس کا جواب ان کے پاس صرف ایک ہوا کرتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے جو خصوصیات ایک شخص میں پائی جانی چاہئے، وہ مجھ میں نہیں ہیں۔ گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان کے عقاید کے مطابق پہلے ہی سے مسلمان ہے اور خود اپنی عقل سے کام لینا گناہ سمجھتا ہو۔ اگر واقعی قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایک شخص اپنے آپ کو ایک قدامت پرست مسلمان ثابت کرے، تو بیشک مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے، لیکن اگر قرآن "ذکریٰ للعالمین" ہے اور وہ تمام نوع انسانی کو دعوت دیتا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولویوں کا یہ کہنا کہ قرآن پاک کا سمجھنا صرف مولویوں ہی کے لئے مخصوص ہے، کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے

میں اگر قرآن پاک کو خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس کا سبب صرف یہ ہے خود قرآن سے یہی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ سے میں خدا و رسول کی توہین و تکذیب کرتا ہوں، حالانکہ میری رائے میں خدا اور رسول اللہ کی حقیقی عظمت اسی میں ہے کہ اسے کلام انسانی سمجھا جائے (جس پر میں تفصیل کے ساتھ اسی مہینے کی اشاعت میں کسی دوسری جگہ اظہار خیال کر چکا ہوں)

وہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلاف کے عقیدہ کے خلاف ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام اسلاف کی پیروی کا نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کا ہے۔ اگر اسلاف یہ عقیدہ رکھتے تھے تو وہ خود اس کے ذمہ دار تھے، ہم اس کے ماننے پر کیوں مجبور ہوں اور اگر صرف کسی کو مرتد و ملحد کہکر قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے، تو اس سے زیادہ ان کی "بے مایگی" اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمارے علماء کا یہ طرزِ عمل کہ وہ اپنے یا اپنے اقوال کے خلاف کوئی بات سننا گوارا کر ہی نہیں سکتے اور فوراً مشتعل ہو کر لوگوں پر جنت کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، یادگار ہے اس کلیسائی دور کی جب مذہب نام تھا بے چون و چرا پادریوں کی تقلید کا (کیونکہ عیسوی مذہب کسی عقلی بحث کا حریف نہ ہو سکتا تھا) اور چونکہ تاریخ اسلام میں بھی ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب شاہانِ اسلام سیاسی اغراض کی بنا پر ملاؤں سے غلط فتوے حاصل کیا کرتے تھے اور مولوی اپنی حمایت میں حکومت کی تلوار سے فائدہ اٹھاتے تھے، اس لئے وہ ذہنیت اب بھی چلی آتی ہے، لیکن ان کو سمجھنا چاہئے کہ مذہب کے باب میں اب ان اوچھے ہتھیاروں سے کام لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ جن نئے ہتھیاروں سے مذہب پر حملہ ہو رہا ہے، انھیں ہتھیاروں سے جواب دینا پڑے گا، محض غیظ و غضب، یا کافر سازی سے کام نہیں چل سکتا۔ اور یہی ہے وہ اصولی اختلاف میرے اور مولویوں کے درمیان جس کو وہ میرے کفر و الحاد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ میں اسلام کو تبلیغی اور فطری مذہب سمجھتا ہوں، اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ اس کی ہر ہر بات عقل پر پوری اترنا چاہئے اور اسی لئے میں مسلمانوں کے عام عقاید کو درست نہیں سمجھتا اور قرآن پاک سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پھر اگر واقعی مجھ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے تو اس پر مجھ کو متنبہ کرنا چاہئے، نہ یہ کہ صرف بدنفسی سے کام لیکر جاہل مسلمانوں کو میرے خلاف مشتعل کیا جائے، اور بازاری لب و لہجہ میں مجھ پر لعن طعن کی جائے۔

مولویوں کا ایک اعتراض مجھ پر یہ بھی ہے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مجھے تاویل کا کیا حق حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیا قرآن میں تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو نہیں اور مجھے دونوں کو برابر کا حق حاصل ہے اور اگر نہیں ہو سکتی، تو وہ قرآن کے ہر ہر لفظ کے صرف ظاہر معنی مراد لینے پر مجبور ہوں گے اور اسی لئے یہ ممکن نہیں۔ متعدد آیات کلام مجید میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں ایک ہی لفظ کے معنے مقصود کے لحاظ سے کہیں کچھ اور کہیں کچھ لئے جاتے ہیں۔

علماءِ کرام جواب دیں

بہرحال میرے دل میں جو شبہات اس وقت پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہاں بیان کرتا ہوں اور علماءِ کرام سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان کے دور کرنے کی کوشش فرمائیں :-

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے ۔ دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا ۔ لیکن "شئے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شئے ہالک الا وجہہ" اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے اور اس لئے وہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں ، تو کلام مجید کا ہر نسخہ ، کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضایع ہو جائے ، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضایع ہو گیا ۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے ۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے ۔ اس لئے لامحالہ اسے "صفتِ ربانی" ماننا پڑے گا ۔ لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اسکی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے ۔

(۴) اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا ، جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے ۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے ۔ اس لئے وہ قرآن جو اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے ، اس قرآن سے بہ لحاظ ترتیب مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا تھا ۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے ، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہئے ۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالتمآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی ، اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی

وجاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنار پر پہلے ہی سے تمام آیات وحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود تھا تو پھر اُن آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُل سے شروع وتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درانحالیکہ اُس وقت رسول اللہ کی ذات نیا میں موجود نہ تھی۔ اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے کیا رسول اللہ ی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؟

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للّٰہ سے لیکر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً "ایاک نعبد" سے اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوحِ محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا اندازِ تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بکثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے، جن کا تعلق بالکل عہدِ نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفارِ مکہ اور اُن کے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلقِ عالم کے وقت لوحِ محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بصورتِ مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ درانحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں، لیکن اس کی سماعت و بصارت، کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہو کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے، تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے۔ جس طرح اسکو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظِ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جنکی بنا پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں۔ لیکن اگر

ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلامِ خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے، تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علیٰ وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہؐ پر نازل کئے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

ہندوستان کے چند اور مرتد مسلمان

جناب فضل الدین اثرام۔ اے۔ آگرہ۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

قرآن یا اس سے متعلق موضوعات پر آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے والی چیز ہوتی ہے اور یقیناً موجودہ مسلمانوں کے حق میں بڑی خدمت ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ہر سال نگار کے کچھ پرچے گنوا بیٹھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بعض لوگوں پر اس قسم کی تحریروں کا اثر دیکھنے کے لئے انھیں دیدیتا ہوں اور مجھے اپنے تجربہ کا بڑا صلہ مل جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ بھی جو زندگی میں حدودِ آب و گل سے آگے کچھ دیکھنے یا سوچنے کے عادی نہیں ہیں آپ کی تحریر پڑھکر سوچنے لگتے ہیں۔ مسلمان قوم کے زوال کی غالباً تنہا وجہ یہی ہے کہ اس نے ہر چیز کے متعلق سوچنا بند کر دیا ہے۔ میں بھی مسلمان قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی سمجھتا ہوں کہ اسے از سرِ نو سوچنے کا عادی بنا دیا جائے۔ قرآن سے متعلق پچھلے مہینے آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب میں نے جولائی کا نگار ایک صاحب کو جو دُنیاداری میں صبح سے شام تک لگے رہتے ہیں پڑھنے کے لئے دیا تو انھوں نے اسی دن رات کو مجھ سے قریب ایک گھنٹہ گفتگو کی اور یہ سب گفتگو آپ کی موافقت میں تھی۔ وحی کی جو توضیح آپ نے کی ہے وہی توضیح بعض تعلیم یافتہ عیسائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے مجھے پنجاب کے پادری عبدالکریم ہمیشہ یاد رہیں گے۔ وحی کی توضیح کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ انجیل "کلامِ خدا" نہیں بلکہ "محرّفِ کلامِ خدا" ہے۔

یہ کہنا کہ خدا کے تمام منصوبے اور ارادے کسی ایک کتاب پر ختم ہو جاتے ہیں، خدا کی برتری کو ٹھیس لگاتا ہے ۔۔۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی تصنیف کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانے سے رسول اپنی حیثیت سے بہت گر جاتے ہیں۔

(نگار) اس مہینے کا نگار ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا تفصیل کے ساتھ اپنی رائے لکھئے اور دوسروں کو دکھا کر ان سے بھی پوچھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

جناب مسلم حیدر آبادی فرماتے ہیں:

میں نے حیدر آباد کے اخبارات کو توجہ دلائی ہے کہ ماہ جون و جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر اکثر حضرات (جو مستند علماء کرام سے نہیں ہیں) ذریعۂ اخبارات بلادلیل نیاز کے ارتداد کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے مستند علماء کرام اس مسئلۂ خاص میں قرآن مجید ہی سے نیاز کا ارتداد ثابت کریں۔

(نگار) معاف فرمایئے آپ نے ان اخبارات سے صحیح مطالبہ نہیں کیا۔ جو علماء کرام وحی کے معنے خدا کا کلام یا "منطوق خداوندی" قرار دیتے ہیں، وہ نہایت آسانی سے میرا ارتداد بھی قرآن پاک سے ثابت کر سکتے ہیں۔
آپ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جو عقلی دلایل میں نے پیش کئے ہیں ان کا جواب دیں اور عقل ہی سے دیں اگر اسلام بے عقلوں کا مذہب نہیں ہے۔

جناب ظہیر احمد صاحب - مظفر نگر - فرماتے ہیں:

میں نے اخبار حق میں آپ کے خلاف کچھ تحریریں پڑھیں، میں نے اس کو خط لکھا ہے کہ جو خیالات نیاز صاحب کے ہیں وہ آجکل اکثر نوجوانوں کے ہیں۔ ان کو آپ جبراً اپنے اعتقادات کا پابند نہ بنائیں اور اظہار غصہ کے بجائے دلایل بیان کریں۔ میں نے اُن کو لکھا ہے کہ کوئی بھی مذہبی کتاب الہامی نہیں ہے۔ انسان الہامی کتب کے پیش کردہ اُصول سے بہتر اُصول بنا سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لئے "انسانیت" کافی ہے۔

(نگار) کیا آپ کو یقین ہے کہ حق جس کے یہاں معیار صحافت نام ہے صرف گالیاں دینے کا وہ آپ کی اس تحریر کو شایع کردے گا۔ کبھی نہیں۔ عقل کی بات کا جواب مولویوں کے پاس اب فتوائے کفر و ارتداد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

رفتار جنگ

افسوس ہے کہ اس مہینہ ملاحظات کے صفحات مجھے خود اس جنگ کے لئے وقف کر دینے پڑے جو میرے خلاف جاری ہے اور مغربی جنگ کے متعلق کوئی رائے زنی نہ کر سکا، حالانکہ اسوقت دُنیا جن گھڑیوں سے گزر رہی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔

ہٹلر کی پیشکش صلح برطانیہ نے رد کر دی اور اب نازی حکومت کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ برطانیہ پر حملہ کرے، لیکن یہ حملہ کب اور کس طرح ہوگا اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے اسپین کی مدد سے جبرالٹر لینے کی کوشش کرے، یا آئرلینڈ پر حملہ کرکے بحر اتلانتک کی طرف سے امریکہ اور برطانیہ کے درمیان خط فاصل کھینچدے لیکن وہ ایسا کرنے سے قبل بلقان کی طرف سے مطمئن ہو جانا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ روس نے بسربیا کا علاقہ لیکر اور بالٹک ریاستوں کو بالشویک اصول حکومت تسلیم کرنے پر مایل کرکے جرمنی کو پس و پیش میں ڈالدیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ برطانیہ پر حملہ کرے اور ادھر روس اور بلقان کی سلافی حکومتیں مشرق کی طرف سے اس پر حملہ کر دیں۔ بہر حال جاڑوں کی آمد سے قبل ہی "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"

عربوں کی سیاسی بیداری

(مسلسل)

جزیرہ نمائے عرب جنگ عظیم کے بعد

نجد و حجاز۔ جنگ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ عثمانی حکومت کی جگہ عربی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور پانچ نئی ریاستیں قایم ہوگئیں (۱) حکومت حجاز (شریف حسین)۔ (۲) سلطنت نجد (ابن سعود) (۳) امامت یمن (امام یحیٰی) (۴) حکومت عسیر (سید محمد بن علی ادریسی) (۵) حکومت شامار (Shammar) (ابن الرشید) اس تبدیلی نے عربستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا نئے نئے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہوئے مگر اُن کا تمام تر تعلق نوزائیدہ حکومتوں کے داخلی و خارجی مسائل سے تھا۔ ابن الرشید اور ابن سعود کے مابین شدید کشیدگی تھی اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ مدتوں سے خاندانی دشمنی کا ایک سلسلہ چلا آرہا تھا۔ دوسری طرف امام یحیٰی اور ادریسی کے تعلقات بھی بیحد ناخوشگوار تھے، اس کے وجوہ آگے بیان کئے جائیں گے۔ سب سے زیادہ اہم ابن سعود اور شریف حسین کی کشیدگی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے بیحد نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ جنگ کے خاتمہ اور صلح کے بعد عربستان کو جو بھی فوائد حاصل ہوئے ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُسوقت جزیرہ نمائے عرب میں حقیقی صلح کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور طرح طرح کے مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے۔

شریف حسین کو اُسوقت دو حیثیتیں حاصل تھیں یعنی وہ ارض مقدس کا حکمراں بھی تھا اور عربوں کی فوجی تحریک کا قاید بھی۔ موخر الذکر حیثیت نے اگر ایک طرف اسکی حیثیت بلند کردی تھی تو دوسری طرف پریشان کن حد تک اُسکی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی تھیں۔ ایک طرف ہندوستان کے مسلمان ناراض تھے کہ اُس نے سلطان کے ساتھ غداری کی ہے اور اُس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ دوسری طرف قوم پرور عرب مجبور کررہے تھے کہ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے ایفاء عہد کا مطالبہ کرے۔ ابن سعود کی دشمنی نے شریف حسین کی حیثیت اور زیادہ نازک

کردی تھی۔ اُس کو اپنی اور ابن سعود دونوں کی جنگی طاقت کا پورا پورا احساس تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اگر کسی دن نجد و حجاز برسرِ پیکار ہوئے تو اُس کے لئے برطانیہ کی امداد ضروری ہوگی۔ اسی خیال سے وہ برطانیہ و فرانس کو اُن کے وعدے پورے کرنے کے لئے زیادہ مجبور کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ابن سعود اور شریف حسین کے تعلقات خوشگوار ہوتے تو شاید برطانیہ و فرانس کو اپنے وعدے پورے کرنے پڑتے۔

جہاں تک بغاوت کی تیاریوں کا تعلق تھا شریف حسین نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا مگر بغاوت کے بعد جب عربستان میں نئے دور کا آغاز ہوا تو شریف حسین سے اُسی قدر ناعاقبت اندیشی بھی ظاہر ہوئی۔ سب سے بڑی غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ اُس کے دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ بغاوت کی چونکہ اُس نے قیادت کی ہے اس لئے ہمسایہ حکومتوں پر اس کو ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ جہاں تک برطانیہ کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور بغاوت کے آغاز کا تعلق تھا ابن سعود اور ادریسی دونوں نے شریف حسین کے ان اقدامات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور قومی تحریک کی قیادت اس کو بخوشی سونپ دی اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا مگر اُن لوگوں کو کبھی اُس کا گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ آگے چل کر شریف حسین خود ان لوگوں کے داخلی معاملات میں بھی دست اندازی کرے گا۔

خود ابن سعود کو وہابی تحریک کے سردار کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ صرف نجد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام عربستان میں اُس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

شریف حسین اور ابن سعود میں پہلا تصادم مئی سنہ۱۹ء میں ترابیہ (Turaba) کے نزدیک ہوا اس لڑائی میں ابن سعود کو کامیابی ہوئی اور اگر عین موقعہ پر برطانیہ، شریف حسین کی حمایت کے لئے میدان میں نہ آجاتا تو ابن سعود کی فوجیں بلا روک ٹوک حجاز تک پہونچ جاتیں۔ اس واقعہ نے شریف حسین اور اُسکے بیٹوں کی آنکھیں کھولدیں اور اُن کو اپنی جنگی کمزوریوں اور ابن سعود کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوگیا۔ اس موقعہ پر سب سے بہتر راہ یہ تھی کہ شریف حسین اور ابن سعود کے مابین صلح کرادی جاتی اور یہ فرض برطانیہ کا تھا۔ خود شریف حسین کے لئے بھی ضروری تھا خواہ اُس کو ابن سعود کو کچھ دینا ہی کیوں نہ پڑتا۔ مگر برخلاف اس کے شریف حسین نے ابن سعود کے قدیم دشمن ابن الرشید سے معاہدہ کی پالیسی کو پسند کیا۔ اسی سلسلہ میں کچھ اور قبایلی سرداروں سے بھی اُسنے معاہدے کئے اور امام یحییٰ پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی۔

جنوری سنہ۲۱ء میں برطانوی افواج نے حدیدہ (Hadaeda) خالی کیا اور اُس کے ساتھ ہی ادریسی نے اُس پر قبضہ کر کے عسیر کی سلطنت میں اُس کو شامل کرلیا۔ عثمانی دور میں یہ بندرگاہ یمن کا تھا ادریسی کے قابض ہوجانے کی وجہ سے یمن کی تجارت کو اس سے بیحد نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا، اس واقعہ نے عربستان میں ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ اس موقعہ پر شریف حسین نے کچھ تو ابن سعود کے دوست ادریسی کو

نقصان پہونچانے کے خیال سے اور کچھ امام یحیٰی کو اپنا ہمدرد بنانے کے لئے امام یحیٰی کی حمایت کی۔ اسی سال ابن سعود نے اپنے قدیم دشمن ابن الرشید کو شدید شکست دی اور حکومت شامر (Shammar) کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا جس کی وجہ سے حکومت نجد کا ڈانڈا عراق کی سرحد سے مل گیا اور عربستان میں ابن سعود کی طاقت بھی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف شریف حسین کے ایک ایسے دوست کا خاتمہ ہو گیا جس کی ہمدردیاں شریف حسین نے ابن سعود کا مقابلہ کرنے کے لئے حاصل کی تھیں۔

قاہرہ کانفرنس کے کم و بیش چار ماہ بعد ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں برطانیہ نے شریف حسین سے از سر نو گفت و شنید شروع کی اور ایک نئے معاہدہ کا مسودہ طیار کر کے لارنس کو شریف حسین کے پاس روانہ کیا، اس معاہدہ کی دفعات اس درجہ نامعقول تھیں کہ ہر وہ شخص جو عرب مسئلہ کی نوعیت سے واقف ہوتا کسی حالت میں اُس کو قبول نہ کرتا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ برطانیہ کو شریف حسین اور ابن سعود کی کشیدگی کا پورا پورا علم تھا نیز اس کا احساس تھا کہ برطانوی حمایت کے بغیر شریف حسین ابن سعود کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صورت حال کی اس نزاکت سے برطانیہ نے فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس مسودہ میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر چیز یہ تھی کہ اس کی رو سے ایک طرف شریف حسین کے اختیارات محدود ہو جاتے تھے اور دوسری طرف عراق و فلسطین کے علاقوں میں برطانیہ کو "خاص حیثیت" حاصل ہو جاتی تھی۔ صاف الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا کہ سین ریمو کانفرنس (San Remo Conference) میں برطانیہ کے لئے جو انتدابی حیثیت طے پائی تھی اور جس کو قبول کرنے سے عربوں نے انکار کر دیا تھا اُس کو اب نئے انداز میں قبول کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی، شریف حسین کو اس مسودہ سے بیحد تکلیف ہوئی اور اُس نے لارنس کو بُری طرح پھٹکارا۔

۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں پھر گفت و شنید کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ کم و بیش ایک سال تک جاری رہا۔ اس مرتبہ مابہ النزاع مسئلہ فلسطین کا تھا۔ برطانیہ کی خواہش تھی کہ شریف حسین فلسطین کے انتداب کو نیز اُس برطانوی پالیسی کو تسلیم کرے جس کا اظہار بالفور اعلان میں کیا گیا تھا (یہاں پر یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ اس اعلان میں فلسطین میں بسنے والے عربوں سے صرف اُن کی شہری اور مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا) پہلے تو شریف حسین اس پر اڑا رہا کہ برطانیہ نے دوران جنگ میں جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو پورا کیا جائے۔ بعد میں اُس نے خود ایک تجویز پیش کی کہ فلسطین میں ایک قومی حکومت قایم کی جائے جس میں یہودیوں کو بھی نمایندگی حاصل ہو مگر کسی حال میں بھی اس کی "سیاسی و اقتصادی آزادی" دوسری عرب حکومتوں سے کم نہ ہو اور اُس کو عرب حکومتوں کے وفاق میں شرکت کا بھی حق دیا جائے۔

۱۴ اگست ۱۹۲۴ء کو شریف حسین نے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کو ایک پرزور خط لکھا جس میں

اُن وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جو دوران جنگ میں عربوں سے کئے گئے تھے۔ ابھی اس خط کو لکھے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہابی فوجوں نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور شریف حسین کو حکومت حجاز سے دستبردار ہونا پڑا۔ اُس نے انگریزوں سے امداد طلب کی مگر اس کو صاف جواب دیدیا گیا کہ یہ کوئی سیاسی لڑائی نہیں بلکہ مذہبی لڑائی ہے اور برطانیہ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بالآخر پورے حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہو گیا اور جنوری سنہ ۲۶ء میں ابن سعود کو حجاز کا باضابطہ بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

اس جدید دور نے عربستان میں ایک نئے باب کا آغاز کیا جس میں ابن سعود کی ذات بہت نمایاں ہے۔ اسکے ساتھ ہی مغربی عربستان کی زندگی میں انقلابی تبدیلی کا ظہور ہوا۔ ملک میں ایک نئی حکومت قایم ہوئی جس نے عوام کے اندر شہری فرائض کا احساس پیدا کیا قدیم عربی روایات اور اسلامی فقہ کی تجدید ہوئی۔ ابن سعود کے سامنے چند اہم اور پیچیدہ مسایل بھی تھے جن کا فوری حل ضروری تھا یہ مسایل صرف داخلی نہ تھے بلکہ اُن کو بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ وہ ایک طرف اسلام کے ارض مقدس کا حکمراں تھا اور دوسری طرف اُس کو وہابی تحریک کی سرداری بھی حاصل تھی اور وہابیوں اور دوسرے اسلامی گروہوں میں شدید اختلافات تھے۔ اُس کے بعد حدودِ حکومت کے تعین کے متعلق کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ تیسرا اہم مسئلہ برطانیہ اور دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ ان تمام مسایل کو ابن سعود نے بڑی دور اندیشی و تدبر کے ساتھ حل کیا۔

مئی سنہ ۲۷ء میں ابن سعود نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو "معاہدۂ جدہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ متعدد اعتبار سے اُس مسودہ سے بالکل مختلف ہے جو شریف حسین کے سامنے لارنس نے پیش کیا تھا۔ اس معاہدہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ عراق و فلسطین کے علاقہ میں برطانیہ کی "خاص حیثیت" کا کوئی ذکر نہ تھا، جس سے بالفور اعلان کی تائید ہوتی۔ اس معاہدہ کی رو سے "جلالۃ الملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل السعود" کو نجد و حجاز کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی مدت صرف سات سال تھی چنانچہ سنہ ۳۴ء میں طرفین نے اسکی تجدید کی۔

برطانیہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے بعد ابن سعود نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے اُن غیر حکومتوں سے معاہدے کئے جن کا تعلق اسلامی ممالک سے تھا۔ چنانچہ ایک طرف ہالینڈ، فرانس، روس اور اٹلی، دوسری طرف ایران و ترکی سے معاہدے کئے۔ عرب نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم معاہدے وہ ہیں جو ابن سعود نے عرب حکومتوں سے کئے ہیں یعنی یمن، عراق اور مصر سے، جنہوں نے اقتصادی اور تمدنی ترقی کی وہ تمام شاہراہیں کھولدیں جو اب تک بند تھیں۔ ابن سعود کے دور حکومت میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ نجد کے خانہ بدوش عربوں کو اُس نے بستیوں میں آباد کیا اسوقت تک کم و بیش اُن کی ستر نو آبادیاں قایم ہو چکی ہیں ان

بستیوں میں چار سو سے لیکر چھ ہزار تک لوگ آباد ہیں اور اب بجائے صحرانوردی کے وہ زرعی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ابن سعود کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ابن سعود کے زمانہ تک عربستان میں باربرداری کا کام اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ کام موٹر لاریوں اور موٹر ٹرک سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رسل و رسایل اور آمد و رفت کے جدید ترین وسایل کو بھی ملک میں روشناس کیا جا رہا ہے۔ وہ سڑکیں جن پر پہلے کارواں گزرا کرتے تھے اب وہاں موٹر دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ملک میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے اور انسان بہ آسانی جدہ سے لیکر مدینہ تک اور بحر احمر سے لیکر ابنائے فارس تک موٹر پر سفر کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں لاسلکی کے اسٹیشن قایم ہیں۔ نئی نئی معدنیں تلاش کی جا رہی ہیں۔

تاریخ انتداب عرب جنگ عظیم کا اختتام عربستان کے شمالی علاقہ کے لئے مصایب اور خلفشار کا ایک طوفان عظیم اپنے ساتھ لایا۔ وہ علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے وہاں مصائب و کشمکش کی تمام ذمہ داری یورپی طاقتوں کے اشتعال انگیز اقدامات کے سر ہے۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے خود عاید کردہ فرض کو ادا کرنے کے لئے سین ریمو (San Remo.) کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں یہ فساد و خونریزی ناگزیر تھی۔

انتداب خود مجلس اقوام کا عاید کردہ نہ تھا۔ بلکہ یہ تجویز تھی اُس سپریم کونسل ( ) کی جو اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے نمایندوں پر مشتمل تھی اور یہی تین طاقتیں تھیں جن کے مفاد عثمانی سلطنت کے علاقوں سے وابستہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اطمینان سے ساتھ عثمانی حکومت کے حصے بخرے اپنے اپنے مفاد کے مطابق کئے۔ مجلس اقوام نے عثمانی سلطنت کے متعلق یہ اُصول قایم کر دیا تھا کہ انتداب کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ کے باشندوں کی خواہش کا احترام ضروری ہے مگر اس اُصول کو سپریم کونسل کے ممبروں نے قطعاً پس پشت ڈال دیا جہاں تک ملک کے بسنے والوں کی خواہش کا تعلق ہے، اُس کا علم اتحادیوں کو پورا پورا تھا، کیونکہ کنگ کرین کمیشن رپورٹ (King Crane Commission Report.) اور دمشق کانگرس کی تجاویز اُنکے پاس موجود تھیں۔ مگر اس معاملہ میں فرانس و برطانیہ کی رہنمائی صرف اُن کے مفاد نے کی۔

سپریم کونسل نے مجلس اقوام کے ایک اور اُصول کو ٹھکرا دیا جس میں واضح انداز میں تاکید کی گئی تھی کہ عثمانی سلطنت کی بعض قومیں جو منازل ترقی طے کر چکی ہیں اور وہ آزاد اقوام کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہیں اُن کو صرف تھوڑے عرصہ کے لئے معمولی طور پر زیر انتداب رکھا جائے تاکہ وہ سیاسی اور انتظامی امور میں پختہ کار ہو جائیں اور خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ جہاں تک عراق و شام کا تعلق ہے سین ریمو کانفرنس نے اس اُصول کا برائے نام ہی سہی مگر احترام کیا۔ لیکن فلسطین کے مسئلہ میں تو ان لوگوں نے کمال ہی کر دیا

یہاں تو برائے نام بھی اس اُصول کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ فلسطین کا انتداب برطانیہ کو سونپا گیا اور اُس سلسلہ میں آزادی تسلیم کرنے کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔

انقلابی علاقہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا:۔

(۱) عراق مع ولایت بصرہ، موصل اور بغداد (برطانیہ) ـــــ (۲) فلسطین (برطانیہ) ـــــ

(۳) شام کا مشرقی اور مغربی علاقہ اور لبنان (فرانس) ـــــ (۴) عراق۔

عراق سین ریمو کانفرنس کے فیصلہ کی اشاعت کے ساتھ ہی عربستان میں شدید خلفشار کے آثار نظر آنے لگے۔ عراق میں تو باضابطہ بغاوت ہوئی۔ اگرچہ یہ بغاوت کامیاب نہیں ہوئی اور عراق بارہ سال تک زیر انتداب نہیں رہا مگر حکومت کی پالیسی میں تبدیلی یقینی طور پر ہو گئی۔ عراق کا بادشاہ فیصل کو منتخب کیا گیا اور اس انتخاب میں کسی قسم کی بے عنوانی نہیں ہوئی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیصل کے انتخاب کے لئے زمین انگریزوں نے تیار کی۔ یہ قصہ ۲۳ اگست سنہ ۲۱ء کا ہے، اور یہ دور فیصل کے انتقال کے وقت (۸ ستمبر سنہ ۳۳ء) تک جاری رہا۔ فیصل کے دور حکومت میں ملک نے سیاسی ارتقاء دستوری ترقی اور آزادی کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں۔ فیصل خداداد قابلیت اور عجیب وغریب اہلیت کا مالک تھا۔ ملک کے اہم ترین اور پیچیدہ مسایل کو اُس نے جس خوبی کے ساتھ سلجھایا ہے اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

۳ اکتوبر سنہ ۳۲ء کو عراق کو باضابطہ مجلس اقوام کا ممبر تسلیم کیا گیا اور یہ اُس کی دستوری ترقی کی آخری منزل تھی۔ اس درمیانی دور میں برطانیہ و عراق کے مابین چار معاہدے مختلف اوقات میں ہوئے اور ہر معاہدہ کے وقت دونوں میں شدید کشاکش رہی۔ ہر موقعہ پر برطانیہ نے گھما پھرا کر عراق سے سین ریمو کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرانے کی کوشش کی اور دوسری طرف عراق نے خود برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانا چاہا۔ دونوں ملکوں کے بیچ میں فیصل کی ذات حایل تھی جو توازن برابر کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض وقت صورت حال اس درجہ نازک ہو جاتی کہ ظاہرا مصالحت کے سب دروازے بند نظر آتے۔ فیصل ایک طرف برطانیہ کو دباتا اور دوسری طرف قوم پرور عرب لیڈروں کو زیادہ وسیع نقطہ نظر رکھنے کی تعلیم دیتا۔ غرض یہ فیصل ہی کی ذات کا کرشمہ تھا کہ ہر بار اُلجھے ہوئے مسایل سلجھ جاتے اور مصالحت ہو جاتی۔

عراق کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب عیسائی اور اسی ہزار کے قریب یہود عراق میں آباد ہیں۔ یہودیوں کی بیشتر آبادی بغداد میں ہے۔ ملک کی ۴/۵ آبادی خالص عرب ہے۔ ۱/۵ حصہ میں بیشتر آبادی کردیوں کی ہے جو سنی مسلمان ہیں۔ اُن کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہو گی اور اُن کی بیشتر آبادی ولایت موصل کے شمال میں ہے۔ عراق میں ۳۵ ہزار کے قریب نسطوری عیسائی بھی پائے

جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ شروع میں ان اقلیتوں کی وجہ سے بڑے بڑے اُلجھاؤ پیدا ہوئے مگر فیصل نے اس مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا اور اب تمام اقلیتیں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہیں

شام و لبنان

جنگ کے بعد عراق نے جو ترقی کی اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن جہاں تک شام کا تعلق ہے اُس کا دامن اُن ترقیوں سے قطعاً "پاک" ہے۔ عربستان کا یہ علاقہ فرانس کے حصہ میں آیا خلفشار اور خونریزی شام میں بھی ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سنہ۱۹۳۶ء میں فرانس و شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا ہے جس سے مستقبل کے متعلق کچھ امید بندھی ہے۔ لیکن انتداب کے وقت سے لیکر اس معاہدہ کے وقت تک شام نے سوا تباہی و بربادی کے اطمینان و بہبود کی شکل نہیں دیکھی۔

سین ریمو کانفرنس میں فرانس نے کوشش کر کے شام و لبنان کا انتداب حاصل کیا اور دونوں علاقوں میں جداگانہ انداز کی حکومتیں قایم کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس دونوں علاقوں سے جداگانہ انداز اور مختلف نوعیتوں کے فایدے اُٹھانا چاہتا تھا۔ لبنان کا علاقہ مشرق قریب میں فرانس کے اثر اور رسوخ کا آہنی قلعہ تھا۔ اسی علاقہ میں فرانس کے قدیم دوست، میرونائٹ عیسائی آباد تھے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے فرقے بھی وہاں جو آباد تھے وہ بھی فرانس کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ برخلاف اس کے شام میں عرب مسلمان آباد تھے اور دمشق تو عربستان کی قومی تحریک کا مرکز ہی تھا چنانچہ فرانس نے لبنان کو مضبوط اور شام کو کمزور کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس سلسلہ میں فرانس نے جو سب سے پہلا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ شام کے علاقہ سے کچھ حصہ نکال کر لبنان میں شامل کر کے اُس کا رقبہ بڑھا دیا۔ یہ نیا علاقہ شمال و جنوب اور مشرق سے لیا گیا۔ اس اضافہ کی وجہ سے ایکطرف کچھ ساحلی علاقہ لبنان میں شامل ہو گیا اور طرابلس، بیروت اور سیڈون وغیرہ کے ساحلی شہر اُس میں شامل ہو گئے اور بعلبک اور بقاع کے زرخیز میدان بھی اس کو مل گئے۔ اس کی وجہ سے دوسری طرف شام کی بحری تجارت کا تقریباً بالکل خاتمہ ہو گیا اور اُن علاقوں کی مسلمان آبادی بھی اس سے بیحد برافروختہ ہوئی کیونکہ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔

اپنے اثر والے علاقہ میں اضافہ کرنے کے بعد فرانس نے اُس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فیصل کی عربی حکومت کے دور میں ملک کو حاصل تھا۔ چنانچہ ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) حکومت لاذقیہ:- یہ علاقہ لبنان اور سنجاق اسکندرونہ کے درمیان واقع ہے اور اسکا دارالسلطنت لاذقیہ ہے

(۲) جبل دروز:- یہ دمشق اور ماورا اردن کی سرحد تک ہے اور پہاڑی علاقہ ہے اسکا دارالسلطنت سویدہ ہے

(۳) حکومت شام:- اس کا دارالسلطنت دمشق ہے اور باقی ماندہ انتدابی علاقہ پر مشتمل ہے۔

اُن کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں فرانس نے قایم کی ہیں۔

شام ولبنان کی آزادی

فرانسیسی انتداب کی تاریخ بہ آسانی تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے دور (سنہ ۲۰ء سے سنہ ۲۶ء) کو دورِ تاریک سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ ناعاقبت اندیشی اور ظلم و حماقت کا وہ دور تھا جس میں حکمران طبقہ نے نفرت اور بے اطمینانی کی تخم ریزی کی اور اس کا ثمر سنہ ۲۶ء کی بغاوت کی شکل میں اُن کو ملا۔ یہ دور اسی بغاوت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ دوسرا دور (سنہ ۲۶ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک) گفت و شنید کا دور ہے۔ فرانس کو اس دور میں تمام دنیا کے سامنے اپنی نااہلی اور خام کاری کے لئے رسوا ہونا پڑا۔ اسی زمانہ میں فرانس نے عرب لیڈروں سے مصالحت کی بھی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ تیسرا دور سنہ ۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اُس معاہدہ سے ہوتی ہے جو فرانس نے بعد از خرابیِ بسیار شام سے کیا۔

پہلا دور مارشل لا اور کشت و خون کا دور تھا جس میں فرانس نے جی کھول کر ظلم کیا۔ بالآخر سنہ ۲۵ء میں تنگ آمد بہ جنگ آمد عربوں نے بغاوت کی۔ یہ قصہ ۲۱ر جولائی کا ہے۔ اس موقعہ پر فرانسیسی فوجوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ فرانس نے فوراً تیس ہزار آزمودہ سپاہیوں کی ایک فوج روانہ کی مگر باغیوں نے انکو بھی شکست دی اور کوئی ⅔ فرانسیسی فوج اس معرکہ میں کام آئی اور تمام سامان حرب بھی باغیوں نے لوٹ لیا باغی فوج بڑھتی ہوئی دمشق تک پہونچ گئی۔ اس موقعہ پر عرب لیڈر جو قید تھے وہ جیل خانوں سے نکل بھاگے اور باغیوں سے آملے یہ تقریباً سب کے سب دروزی عیسائی تھے۔ اب اس بغاوت نے بالکل قومی رنگ اختیار کرلیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے لئے فرانس نے بعض ایسے انسانیت سوز مظالم کئے ہیں کہ ان کی دوسری مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں مل سکے۔ بہرحال بغاوت بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور حکومت نے اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کی۔

اس دور کی ابتدا، ام، پونسوٹ (M. Ponsot) کے ہائی کمشنر کے عہدہ پر تقرر سے ہوتی ہے یہ ایک تجربہ کار سویلین تھے، انھوں نے سب کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور عرب حلقوں میں اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کے باوجود فرانس اور شام کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہوسکا۔ ام، پونسوٹ نے اپنے تقرر کے چوتھے سال جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور کچھ عرصہ کے بعد نئے دستور کے ماتحت انتخابات عمل میں آئے۔ اس موقعہ پر انھوں نے اپنی غیر جانبداری کا پورا ثبوت دیا۔ اس چیز نے اُن کو عرب حلقوں میں بیحد مقبول بنا دیا۔ ام پونسوٹ نے اپنے قیام کے آخری سال میں ایک نئے معاہدہ کا مسودہ عرب جمہوریت کے سامنے پیش کیا مگر عرب لیڈروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اسی سلسلہ میں دو قوم پرور عرب لیڈروں

نے شامی کابینہ سے استعفیٰ بھی دیدیا۔ اب پھر عربوں میں جوش و خروش کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی زمانہ میں ام، پونسوٹ نے اپنے عہدہ کی مدت پوری کی اور ان کی جگہ پر ام، ڈی، مارٹل (M. D. Martel) کا تقرر ہوا انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شامی کابینہ کے وزیر اعظم کو بلاکر اس مسودہ پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ وزیر اعظم فرانسیسی حکومت کے نامزد کردہ تھے، انھوں نے اُس مسودہ پر دستخط کردے۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس ملی کے سامنے پیش ہوا تو ممبروں کی اکثریت نے اُس کو مسترد کردیا اس کے جواب میں ام، ڈی، مارٹل نے مجلس ملی کو غیر تعینہ مدت کے لئے معطل کردیا۔ اسی سلسلہ میں ٹاؤن ہال میں جلسہ ہورہا تھا کہ یکایک پولیس نے چھاپا مارا اور بیشتر لیڈروں کو گرفتار کرلیا۔ اُن لوگوں پر جرم ثابت نہ ہوسکا مگر اُن کو جلاوطن کردینا حکومت نے مناسب سمجھا۔ اس چیز نے تمام ملک میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک آگ لگادی اور پورے ملک میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ابھی ہڑتال ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ اور عرب لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔ حکومت کے اِس اقدام نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک بھر میں بغاوت کی فضا پیدا ہوگئی اور ہڑتال برابر جاری رہی، جس کی وجہ سے ملک کے کاروباری حلقہ میں جمود پیدا ہوگیا۔ اس کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا اور حکومت کی انتھک کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم نہ ہوسکی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑی۔ یعنی فرانس اور شام کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو انگلستان اور عراق کے معاہدہ کے طرز کا تھا۔

فرانس نے شام میں جو تجربات حاصل کئے اس کی قیمت بھی اُس کو بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔ ہزاروں فرانسیسی جانیں ایک طرف ضایع ہوئیں اور دوسری طرف فرانسیسی خزانہ پر فوجی اخراجات اور دوسری ضروریات کے سلسلہ میں ۱۲ کرور پونڈ (تقریباً ایک ارب ۴۴ کرور روپیہ) کا بار پڑا۔

فلسطین سب سے آخر میں فلسطین کے ناکام انتداب کا نمبر آتا ہے۔ انتداب فلسطین کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بہت کافی مواد موجود ہے۔ لیکن اول تو وہ حد درجہ منتشر ہے اور اگر یکجا بھی کرلیا جائے تو اس کو ہاتھ لگانے میں بیحد احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو غیر جانبدار اور دیانتدار مصنفین ہیں اُن کی تصانیف بھی بہت کم پائی جاتی ہے کیونکہ معلومات کے عربی ذرایع اُن کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں دوسری طرف صیہونی پروپیگنڈے کا بحر ناپیدا کنار ہے جو یورپ کے گوشہ گوشہ میں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ عموماً دنیا کے قابل ذکر پرس (Press) اور مغربی جمہوریتوں کے خبر رساں ادارے یہودیوں کی جنبش ابرو پر گردش کرتے نظر آتے ہیں اور خصوصاً انگریزی بولنے اور سمجھنے والی دنیا کے تو تقریباً تمام اخبارات اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ برخلاف اس کے عرب ابھی اول تو پروپیگنڈے کے میدان میں طفل مکتب ہیں اور دوسرے مالی اعتبار سے عربوں کو اس کی استطاعت نہیں کہ اس باب میں وہ

روپیہ پانی کی طرح بہاسکیں یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی کسی زبان میں شاید ہی عرب نقطۂ نگاہ سے کوئی کتاب اس موضوع پر نظر آئے۔ یہودیوں کے پاس دولت کی کمی نہیں اور وہ بے دریغ دولت اِس مقصد کے حصول کے لئے صرف کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ بیس سال سے دنیا فلسطین کے مسئلہ کو صیہونی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہوگئی ہے۔

معلومات کا دوسرا اہم ذریعہ برطانوی سرکاری محکمہ ہوسکتا تھا مگر وہاں بھی میدان صاف نظر آتا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبضہ میں بعض اہم دستاویزیں ہیں جب تک وہ شایع ہوکر عوام تک نہ پہونچیں اُسوقت تک مسئلہ فلسطین کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ دارالعوام اور دارالامراء کے ممبروں نے بارہا حکومت سے ان دستاویزوں کی اشاعت کی اپیل کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی یہودیوں کے لئے دوسری آسانی یہ ہے کہ متذکرہ بالا دونوں ایوانوں میں یہودی ممبروں کی کافی تعداد موجود ہے جو ہر موقعہ پر یہودیوں کی فاضلانہ انداز میں وکالت کرتی ہے لیکن غریب عربوں کی آواز وہاں تک پہونچانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

معلومات کا ایک اور ذریعہ ہے اور وہ پرمانٹ مینڈیٹ کمیشن (Permanent Mandates Commission) کی کارروائیوں کی کتاب ہے۔ مگر یہاں بھی اک طرفہ حالات نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود جنیوا (Geneva) میں یہودیوں کے محکمۂ اطلاعات کا ایک بہت بڑا اور باضابطہ دفتر موجود ہے جو برابر کمیشن کو فلسطین کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس طرح کا کوئی ذریعہ عربوں کے پاس نہیں۔ فلسطین کا عربی پریس جو اطلاعات بہم پہونچاتا بھی ہے اُن کو نظر انداز کیا جاتا ہے میرے اس بیان کی تائید وزراء کی تقریروں اور سفید کاغذ (White paper) کے مطالعہ سے ہوسکتی ہے۔

شاید مسئلہ فلسطین کے مطالعہ کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وہ متعلقہ جماعتیں جو آج فلسطین پر اپنا حق ظاہر کررہی ہیں اُن کے دعوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربوں کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ مدت دراز سے فلسطین میں آباد ہیں اور ملک پر ان کا آج بھی قبضہ ہے اُس کے بعد عربوں کے اُن سیاسی حقوق کا نمبر آتا ہے جو شریف حسین اور برطانیہ کے معاہدہ کی رو سے اُن کو حاصل ہوئے تھے اور جنکے معاوضہ میں عربوں نے جنگ میں اتحادی طاقتوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اب جبکہ شریف حسین اور ہنری میک مان (Mc Mahon) کی خط وکتابت شایع ہوچکی ہے حکومت برطانیہ یا کوئی جماعت اس کا دعویٰ نہیں کرسکتی ہے کہ ارض فلسطین کا تعلق اُس علاقہ سے ہے جس کو مستثنیٰ کردیا گیا تھا۔

فلسطین میں آج عرب جو انتداب کے خلاف برسرجنگ ہیں اُس کا یہود دشمنی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ اسلام کے تمدنی اثر کا طفیل ہے کہ قرون وسطیٰ اور دورِ جدید دونوں دوروں میں عربوں کی تاریخ کا دامن یہودیوں پر مظالم کے داغوں سے قطعًا پاک رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہودی قوم نے تو عرب حکمرانوں کی سرپرستی

میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں۔ اور آج بھی ان تمام قصوں کے باوجود وہ تمام یہودی اقلیتیں جو دوسری عرب حکومتوں میں آباد ہیں اُن کے ساتھ اُس سے کہیں زیادہ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے جو امریکہ یا انگلستان کی حکومتیں اُن ممالک میں بسنے والے یہودیوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ عربوں کو تو انگریزوں سے بھی کوئی دشمنی نہیں وہ تو صرف اپنے اُس سیاسی حق کی حفاظت کر رہے ہیں جو اُن سے چھینا جا رہا ہے۔

فلسطین پر یہودیوں کے حقوق عربوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسطین عہدِ عتیق میں اُن کا وطن تھا اور اب پھر اُن کو وہاں جاکر آباد ہونے اور یہودی ریاست قائم کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہودیوں کے استیصال کے وقت سے لیکر آج تک (۱۸ سو سال سے) فلسطین میں یہودیوں کی بہت ہی قلیل اقلیت آباد چلی آرہی ہے۔ سنہ ۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر فلسطین میں یہودیوں کی آبادی ۵۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو تناسب آبادی کے اعتبار سے آٹھ فیصدی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی آبادی نوے فیصدی تھی۔ مگر یہودیوں کے مطالبہ کی اصل بنیاد یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے اتحادیوں کی جو امداد کی تھی اُس کے معاوضہ میں اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنا دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بالفور اعلان وجود میں نہ آتا تو اتحادی یہودیوں کی گراں قدر خدمات سے محروم رہتے اس لئے یہودی اپنے اس دعوے میں ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے۔ اول تو یہ کہ بالفور اعلان مشروط تھا اور دوسرے یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کرنے سے پہلے ہی عربوں سے ایک معاہدہ کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آزادی برقرار رہے گی اور اس وعدے کو متعدد موقعوں پر برطانیہ نے دہرایا بھی تھا۔

بالفور اعلان میں اس کا وعدہ تو ضرور کیا گیا تھا کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنایا جائے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ "فلسطین کی غیر یہود آبادی کے سیاسی اور مذہبی حقوق پر" یہ چیز اثر انداز نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو صرف ان کا قومی وطن ہی نہ بنایا جائے بلکہ وہاں یہودی ریاست کا قیام بھی عمل میں آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزمین (Weizmann) جو بہت بڑے یہودی لیڈر ہیں انھوں نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے کہ صیہونیت کا مقصد یہ ہے کہ "فلسطین کو اسی طرح یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے جس طرح امریکہ اہل امریکہ کا وطن ہے اور انگلستان انگریزوں کا"۔

انگریزوں نے یہودیوں سے جس وقت یہ وعدہ کیا تھا شاید وہ اسکی اہمیت اور اُسکے نتائج سے واقف نہ تھے۔ عربوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ارادتاً یہ دوہری پالیسی اختیار کی مگر یہ خیال شاید غلط ہے انگریزوں نے جس وقت یہ وعدہ کیا تھا اُس وقت اُن کی موت و زندگی کا سوال درپیش تھا۔ اُن کے پاس اس کا موقعہ نہ تھا کہ اس مسئلہ کی جزئیات پر وہ غور کر سکتے۔ لیکن برطانیہ کو اُس کی اِس پالیسی کے لئے کبھی بھی معاف نہیں

کیا جاسکتا جو اُس نے جنگ کے بعد اختیار کی۔ اُس وقت یہودیوں کے ارادے عالم آشکار ہوچکے تھے اور یہ چیز بھی بالکل صاف ہوچکی تھی کہ قومی وطن کی آڑ لیکر وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے درپے ہیں۔ انگریزوں کو دوسری طرف اس کا بھی علم ہوچکا تھا کہ عرب اپنے وطن اور اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے جان کی بازی بھی لگادینے پر آمادہ ہیں۔ تاریخ پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اس نوعیت کے واقعات کا اگر ابتدا ہی میں سدباب نہیں کیا جاتا تو آگے چل کر شدید خونریزی ناگزیر ہوتی ہے۔

کنگ کرین کمیشن (King Crane Commission) اور دیگر ذرایع بھی آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کرچکے تھے۔ مگر حکومت برطانیہ نے سب کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں یہودیوں نے فلسطین میں جو مظالم شروع کئے تھے وہ راز نہ تھے بلکہ ہر شخص اُن سے واقف تھا۔ یہودی جو روپیہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اُس کو ملکی ترقی پر صرف کرنے کے بجائے عربوں کو اُن کے گھر بار سے محروم کرنے کے لئے پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ حکومت برطانیہ نے پہلے تو ان حادثات کی پرواہ نہیں کی اور مداخلت کی بھی تو یہودیوں کی حمایت میں۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ برطانیہ نے یہودیوں سے کچھ ایسے معاہدے کئے ہیں جو ابتک ظاہر نہیں ہوسکے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت برطانیہ دنیا کے اس دور و دراز گوشے میں بجائے عرب ریاست کے یہودی ریاست کے قیام کو اپنے شہنشاہی مفاد کی حفاظت کے لئے بہتر اور ضروری سمجھتی ہے۔

سنہ ۳۶ء کے موسم بہاراں میں رائل کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اُس کے ساتھ امید بندھ گئی کہ اب حالات کی صحیح جانچ پڑتال ہوجائے گی اور مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن سنہ ۳۷ء میں جب کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی تو تمام امیدیں مبدل بہ یاس ہوگئیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض اعتبار سے کمیشن کی رپورٹ بہت زیادہ قابل ستایش ہے مگر اسی درجہ یہ ناقص و نامکمل بھی ہے۔ اکثر ایسے واقعات بھی اس رپورٹ میں موجود ہیں جو ابتک عوام کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور سرکاری ذرایع سے وہ روشنی میں نہ آسکے تھے۔ اس رپورٹ میں برطانیہ کی بعض غلط کاریوں کو بھی عریاں کیا گیا ہے۔ نیز اُس کے مطالعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ رپورٹ کے مصنفین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ انتداب ناقابل عمل تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کا بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ کمیشن کے ممبر یہودیوں کے بیانات اور پروپگنڈے سے بھی متاثر ہیں اور اس کا اُن کو کوئی احساس نہیں ہے کہ اس فن سے عرب ناواقف ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں نے عربوں کے بیانات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے اُن کی شکایات کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے اس کی ذمہ داری صرف کمیشن کے ممبروں ہی کے سر نہیں بلکہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں نے کمیشن کا مقاطعہ کیا اور کمیشن کی واپسی سے چند روز قبل یہ مقاطعہ ختم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن نے سات آٹھ ہفتے برطانوی اور یہودی گواہوں کے

بیانات پر صرف کئے اور عربوں کے حصہ میں صرف پانچ یوم آئے۔ کل ۱۱۲ اشخاص کے بیانات کمیشن نے قلمبند کئے انمیں صرف ۱۲ عرب تھے اور سو برطانوی اور یہودی اشخاص تھے۔

کمشنروں نے مسئلہ فلسطین کے پس منظر پر بحث کرتے ہوئے بالفور اعلان اور اُن وعدوں پر بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے جو یہودیوں سے برطانیہ نے دوران جنگ کئے تھے مگر برطانیہ نے جو وعدے عربوں سے کئے تھے اُن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ شریف حسین اور ہنری میک ماں (Mc Mahon) خط وکتابت کا سرسری طور پر ذکر ہے مگر بالفور اعلان کے بعد برطانیہ نے جنوری سنہ۱۸ء میں شریف حسین سے جو وعدہ کیا تھا یا جون ۱۸ء میں سات عرب لیڈروں کے میموریل کے جواب میں جو اعلان برطانیہ نے کیا تھا اُن کا کوئی ذکر کمیشن کی رپورٹ میں نہیں ہے۔

کمیشن نے مسئلہ فلسطین کا جو حل پیش کیا ہے وہ اِس خیال پر مبنی ہے کہ عرب اور یہودی دونوں فلسطین میں آباد ہیں اس لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ کمیشن نے اس سلسلہ میں پوری اسکیم پیش کی ہے اُسکی رو سے فلسطین کا مغربی علاقہ یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ مجوزہ علاقہ موجودہ یہودی آبادی کے رقبہ سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمیشن کی یہ بھی تجویز ہے کہ بیت المقدس اور بیت اللحم کے مقدس شہروں میں مستقلاً برطانوی انتداب کا قیام عمل میں لایا جائے اور بقیہ حصہ میں عرب ریاست قایم کی جائے اور اس کا تعلق دوسری عرب ریاستوں سے بھی ہو اور دونوں ریاستوں کو مجلس اقوام کی ممبری کا حق ہو۔ وہ مسئلہ جس کو سلجھانے کے لئے کمیشن کا تقرر ہوا تھا اُس کو کمیشن نے اور بھی اُلجھا دیا ہے۔ جس علاقہ کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس میں اسوقت پانچ لاکھ عرب آباد ہیں۔ اُس پر ستم یہ ہے کہ کمیشن کے ممبروں کا دعوےٰ ہے کہ اُن کی تجویز قابل عمل بھی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کی مجوزہ اسکیم تین اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اول یہ کہ یہ تجویز قابل عمل ہے دوسرے برطانیہ کے تمام سابقہ وعدے اس سے پورے ہوتے ہیں جو عربوں اور یہودیوں کے ساتھ کئے گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ عربوں یا یہودیوں کے ساتھ اس میں بے انصافی نہیں ہوتی ہے۔

فسادات فلسطین کے سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ قدرتی پیداوار نہ تھے بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری آفندی طبقہ کی سازش، مفتی اعظم کے سیاسی اغراض، اٹلی، جرمنی اور روس کے پروپیگنڈے کے سر ہے۔ ابتداء کے فسادات کا جہاں تک تعلق ہے بعض حلقوں میں اس بیان کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر انتدابی حکومتوں کے کمیشن کی رپورٹ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ یہ فسادات در اصل نتیجہ ہیں اُس محبت اور لگاؤ کا جو عربوں کو اپنے وطن اور تمدن کے ساتھ ہے۔ آج بغاوت اپنے شباب پر ہے اور اُس کا سب سے زیادہ زور شہروں میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں ہے اور اس کا فوری سبب رائل کمیشن (Royal Commission) کی تجویز تقسیم ہے جس کی وجہ سے عربوں کو

اپنا گھر بار چھوڑ کر غیر علاقے میں جا کر آباد ہونا پڑے گا۔ تقریباً تمام قومی لیڈر یا تو جیل خانوں میں ہیں یا جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اب عنان قیادت خود مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے گھر بار کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دینے پر تیار ہیں۔ اس جوش و خروش کو کسی طرح بھی غیر ملکی پروپگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ غیر ملکی پروپیگنڈا سلگتی ہوئی آگ پر پنکھے کا کام کر سکتا ہے مگر اس میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بغاوت کو مہینوں اور برسوں تک مسلسل زندہ رکھ سکے۔

اس بغاوت میں تو اعلیٰ طبقہ کے عربوں کو بھی کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ کسان اور مزدور عرب جو بغاوت کر رہے ہیں وہ تو زمیندار عربوں سے بھی کچھ کم ناراض نہیں کہ انھوں نے اپنی جائدادیں یہودیوں کے ہاتھ کیوں فروخت کیں جس کی وجہ سے اُن کو اپنے گھر بار سے دست بردار ہونا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف عرب اپنے لیڈروں سے ناخوش ہیں کہ انھوں نے پہلے ہی اس خطرہ کو کیوں نہیں محسوس کیا تھا۔ غرض اسوقت عنان قیادت اُن کسانوں اور مزدوروں کے ہاتھ میں ہے خود جن کی موت و زندگی کا اسوقت سوال ہے، باغیوں کا تشدد صرف انتدابی طاقت ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا یکساں شکار عرب زمیندار اور وہ دلال بھی ہیں جو خرید و فروخت کے معاملات طے کر رہے ہیں۔

دوسری غلط فہمی یہ پیدا کی جا رہی ہے کہ یہودیوں کی آمد سے عربوں کو اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہودی دولت اور ذہانت سے ملک نے کچھ نہ کچھ اقتصادی ترقی ضرور کی ہے۔ عرب زمیندار اُن کی آمد کی وجہ سے مالدار بھی ہو گئے ہیں اور عرب مزدوروں کی مزدوری بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہودیوں کی آمد ملک کے لئے نئی نئی ضرورتیں اور نئے نئے بار بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ انتدابی پالیسی کی وجہ سے نئی نئی خدمات کی ضرورتیں پیش آئیں، حفاظت عامہ کے لئے پولیس میں اضافہ کیا گیا۔ بلا ضرورت عمارتوں کے ٹھیکے دینے پڑے تاکہ یہودی مزدوروں کے لئے روزگار پیدا کیا جائے۔ ان سب وجوہ سے فلسطین جیسے مفلس ملک کے میزانیہ پر غیر ضروری بار ڈالا گیا۔ ان سب باتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کی آمد سے بہت زیادہ اقتصادی فایدہ پہونچا ہے تو بھی یہ ایک بے حقیقت استدلال ہے کیونکہ اگر ایک طرف فلسطین کو یہ فوایدِ حاصل ہوئے تو دوسری طرف یہی چیز فلسطین میں بسنے والے عربوں کی سیاسی زندگی کا چراغ گل کر رہی ہے۔ سنہ ۱۸ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی تقریباً پانچ فیصدی تھی سنہ ۳۲ء میں یہ بڑھتے بڑھتے اٹھارہ فیصدی ہو گئی اور آجکل جس سرعت کے ساتھ یہودی مہاجرین فلسطین میں آ رہے ہیں اُس سے اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ آیندہ دس سال میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ اقتصادی فوائد کی کوئی حقیقت نہیں رہجاتی۔

مسئلہ فلسطین کا کوئی معقول حل اُسوقت تک دستیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمران انصاف سے کام نہ لے

تشدد خواہ وہ جسمانی ہو یا سیاسی لاحاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں نے جب سے تشدد کی راہ اختیار کی ہے دنیا کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ گئی ہیں اُس سے قبل بیس سال تک جنیوا، لندن اور بیت المقدس میں پُرامن انداز میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی گئیں اور وہ سب ایک ایک کر کے ناکام رہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تشدد سے عربوں کو جسقدر فایدہ ہوا ہے اُسی قدر اُن کی تحریک کو نقصان پہونچا ہے۔ مگر اس تشدد کو ختم کرنے کی پرحکمت اور آسان صورت یہ ہے کہ اُس کے اسباب کا سد باب کیا جائے۔ اس تشدد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ عربوں کا تشدد نتیجہ ہے حکمران طبقہ کے اُس اخلاقی تشدد کا جو عربوں کے ساتھ اُس نے روا رکھا ہے۔ عربوں کے اس تشدد کو اب دُنیا کی کوئی طاقت اُسوقت تک روک نہیں سکتی۔ جب تک کہ حکمران طبقہ اپنے اخلاقی تشدد کو ختم نہ کر دے۔

وہ لوگ جو پروپیگنڈے کے پردوں کو چاک کر کے اصل تصویر کو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے فلسطین کے مسئلہ کا حل تلاش کر لینا زیادہ دشوار نہیں بشرطیکہ حکمران طبقہ بھی عقل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ ایک ایسا ملک جہاں مدت دراز سے ایک ایسی قوم آباد چلی آتی ہو جس کو اپنے وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ ہو وہاں باہر سے کسی دوسری قوم کے آباد ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کو یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں ابتک جو تجربات حاصل کئے گئے ہیں وہ کافی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ عربوں کو یہودیوں کے ساتھ کوئی مخاصمت ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فلسطین کا کسان اپنے وطن سے دستبردار ہونے کے مقابلہ میں اپنی جان قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور اسباب سے قطع نظر صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ فلسطین کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس حقیقت کو محسوس کیا جائے اور اس کو ہر وقت پیشِ نظر رکھا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانا یا وہاں یہودی ریاست کا قیام برطانیہ اور یہود دونوں کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اگر متذکرہ بالا حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسطین کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہاں عربی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور وہاں صرف اسی قدر یہودی رکھے جائیں جس سے عربوں کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے، سب قومیں امن و عافیت کی زندگی گزار سکیں اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسئلہ فلسطین کا یہ حل دیانتداری اور انصاف کا حل ہے اور یہ قابل عمل بھی ہے۔ اس سے فلسطین میں بسنے والے عربوں کے حقوق کی ایک طرف حفاظت ہوگی اور دوسری طرف اُن کے قومی جذبات بھی اس سے آسودہ ہوں گے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اُسوقت فلسطین تمدنی اور روحانی اعتبار سے انکا قومی وطن

بھی بن سکیگا اور اُن کو فلسطین سے جو قدیم تعلق ہے اس کی بھی تجدید ہو سکے گی۔ اُس حالت میں فلسطین کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں گے۔

فلسطین کے مسئلہ کا اس سے زیادہ قابل اطمینان اور قابل عمل حل ملنا دشوار ہے۔ اگر کوئی دوسری راہ اختیار کی گئی تو اُس سے عربوں، انگریزوں اور یہودیوں کی لاتعداد جانیں تلف ہوں گی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا یہودیوں کو یورپ کی حکومتوں میں جن مصائب کا شکار ہونا پڑ رہا ہے اُس سے اُن کو بچانے کے لئے فلسطین کے بجائے کوئی دوسرا ملک تلاش کرنا چاہئے کیونکہ فلسطین خود ایک چھوٹا ملک ہے۔ اسوقت جتنے یہودی وہاں پہونچ گئے ہیں انھیں کا بار اُٹھانے سے وہ قاصر ہے۔ سلطنت برطانیہ بیحد وسیع سلطنت ہے، اُس کے ذرایع اور وسایل بھی اُسی اعتبار سے وسیع ہیں۔ اب جبکہ عربوں کی قسمت پر اُس نے یہودیوں کا حل تلاش کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا یہ اُس کا فرض ہے کہ اُن کو کہیں اور کسی نہ کسی طرح کھپا دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اور دوسری یورپی حکومتوں میں یہودیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم کئے گئے ہیں وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اُن مظالم کے مصنفین کے دامن پر ابد تک رہنے والے بدنما داغ ہیں۔ مہذب حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور آج جو بار فلسطین کے کاندھوں پر ڈالا جا رہا ہے اُس کو وہ خود سنبھالیں۔

محمد عتیق صدیقی

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ:۔ از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔اے (جامعہ) یہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

دیہی جنس:۔ دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی۔سی کمار پا صاحب۔ قیمت ۲ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ:۔ از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

منیجر نگار۔ لکھنؤ

ریڈیو کے آس پاس

شام کا وقت ہے برسات کا موسم، شہر کے چوراہے پر ہوٹل واقع ہے جہاں بارش سے پناہ لینے کے لئے ہر طرح کے بے فکرے۔ مراثی۔ مولوی۔ پنڈت۔ مزدور۔ طالب علم۔ پھیری والے۔ کسان۔ کارخانہ والے۔ جوان۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورت مرد۔ ہوٹل کے برآمدہ میں ریڈیو سٹ کے آس پاس جمع ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ بادل گرجتا ہو ہے۔ مینھ برسنے لگتا ہے۔ ایک کوندا ہوا۔ زور کا ایک تڑاقا۔

مولوی صاحب :- ویسبح الرعد بحمدہ

ایک دیہاتی :- مولوی صاحب اِی کا کرت ہو، برکھا ہوئے دیو۔

ایک نوجوان :- الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔

دوسرا بے فکرا :- لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے۔

ایک آواز :- کہو مولوی صاحب کیسی کہی ؟

مولوی صاحب :- شامتی۔ دوزخ کا ایندھن۔

پنڈت جی :- شانتی، شانتی۔

بے فکرا :- دھن ہے مہاراج۔ کیا نام لیا ہے۔

پنڈت جی :- رام رام، کلجگ میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ (بارش تیز ہو جاتی ہے)

ایک نحیف آواز :- (غمگین لہجہ میں)

یہ کہہ دا ابر و باراں سے اگر برسے تو یوں برسے
کہ جیسے خوں برستا ہے ہمارے دیدہ تر سے

ایک بڑھیا :- ارے کل جبھے، تیری انھیں باتوں سے تو دنیا چوپٹ ہو رہی ہے۔

بڈھا شوہر :- (کھانستے ہوئے) تم کو دنیا کے چوپٹ ہونے کی پڑی ہے۔ یہاں کھانستے کھانستے پلیتھن نکلا جارہا ہے

بڑھیا :- ارے تم کو کھانسنے سے تھوڑے ہی کوئی روکتا ہے۔ دُنیا چوپٹ ہو یا نہ ہو، تم تو کھانسے جاؤ۔

ایک تانگہ والا:- (منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے) بڑے میاں گھر کا جھگڑا گھر میں چکانا۔ تانگہ ہانکتے تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ چلو چھٹ کا میلہ دکھلاؤں۔

ایک کسان:- برکھا دیو کا کرپا۔

ایک موٹا مہاجن:- "بجار مندا ہوا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا"

طالب علم:- کسان سے اُلجھے تو اچھا نہ ہوگا۔

پولیس کا سپاہی:- کچھ برا بھی نہ ہوگا۔

اتنے میں کچھ بچوں کے رونے بلبلانے کی آواز آنے لگی۔ ماؤں نے انھیں پیٹنا اور شوہروں کو کوسنا شروع کیا جوانوں نے گانا اور ادھیڑوں نے سب کو سمجھانا شروع کیا۔ مونگ پھلی والے نے آواز لگائی، خستہ بادام لے لو۔ ہوٹل کا مالک گھومتا ہوا آیا۔ اور بالآخر یہ طے پایا کہ جب تک بارش نہ کھلے ہوٹل کے ریڈیو سٹ سے سب کی تواضع کی جائے

ریڈیو نے تھوڑی سی گھڑگھڑاہٹ کے بعد اعلان کیا:-

"یہ دلّی ہے، اس وقت سات بجے ہیں"

ایک آواز:- کیا بات کہی ہے گویا ہم کو معلوم نہیں۔ وقت البتہ بُرا ہے۔ گھر والی دانت پیس رہی ہوگی۔ ہمسائی گرم مسالہ مانگنے اور چغلی کھانے آئی ہوگی۔

دوسری آواز:- ارے بھائی سننے تو دو۔ گھر کا کھڑاگ کہاں پھیلایا۔ وہ دیکھو کوئی صاحب لکچر دے رہے ہیں

ریڈیو:- ..."یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیئے"

ایک آواز:- واہ بے وا بالکل اُلو کی دم فاختہ ہی ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک صاحب قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ سامنے سے موٹر آئی۔ ادھر ادھر ٹرام موٹر اوپر سے گزر گئی۔ مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔

دوسری آواز:- بھائی زمانہ نازک ہے۔

تیسری آواز:- بڑا نازک جیسے صنفِ نازک۔

چوتھی آواز:- سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ ہاتھ لائیے گا۔ جناب کا تخلص

دور سے ایک آواز:- منحوس۔ (سب قہقہہ لگاتے ہیں)

ریڈیو:- اگر آج ہم اس بات کا عہد کر لیں کہ ہم کو اپنی حالت سدھارنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو نیچا دکھا سکے۔

ایک آواز:- کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ عہد کر لیں، عہد کر لیں۔ عہد کرتے کیا دیر لگتی ہے۔ سینکڑوں دفعہ عہد کئے۔ کیا ہوا۔ نمک حرام۔

دوسری آواز :۔ (بات کاٹ کر) ہاں جی، اور عہد نہ بھی کریں تو کون مائی کا لال ایسا ہے جو ہم کو نیچا دکھا سکے گا۔ ہم مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ اور کیا! (مجمع سے کہیں سے ہنسنے کہیں سے اُف کرنے اور کہیں سے جمائی لینے کی ملی جلی صدائیں)

(ریڈیو کے کھٹکے کی آواز آتی ہے۔ اعلان ہوتا ہے)

ریڈیو :۔ تمام دن اور نصف سے زیادہ رات تک بحث مباحثہ کے بعد بالآخر سبجکٹ کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی۔ "یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم کو ایسے ذرائع اور وسائل جلد سے جلد اختیار کرنے میں غیر معمولی تامل سے کام لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی جن سے اُن امور کی وضاحت ہوتی ہو جو قوم اور ملک کی ایسی ترقیوں میں معین ہوتے ہیں جو زمانہ کے موجودہ مطالبات اور قوم کی گوناگوں ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کو دوسری قوموں کے دوش بدوش رکھنے میں اُن تمام باتوں کا احاطہ کر لیں جو ہماری قومی روایات رواداری کو زندہ اور تابندہ رکھنے کی طرف رہبری کرنے میں اس طور پر معاون ہوتی ہوں کہ یہ ہمسایہ قوموں میں شک و شبہ کے بجائے ایسا اعتماد پیدا کر سکیں۔ جو ان اغراض و مقاصد کے حصول میں معین ہوں۔ جن کے لئے ہمارے آبا و اجداد نے اپنا خون پسینہ ایک کر دینے کے لئے ایسے زریں کارنامے چھوڑے ہیں، جو ہر گری ہوئی قوم کو اُبھارنے کے لئے ایسی متحرکات کی طرف لے جانے میں متعین ہونے کا امکان رکھتے ہوئے ....."

سننے والوں کا سارا مجمع یک لخت گھبرا کر چیخ اُٹھتا ہے۔ کوئی رونے لگتا ہے۔ کوئی دانت پیس کر رہ جاتا ہے ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ مارنا مارنا جانے نہ پائے۔ مدت کے بعد ہاتھ لگا ہے۔ کچھ عورتیں بیہوش ہو جاتی ہیں۔ کوئی مونگ پھلی والے کا خوانچہ لوٹ لیتا ہے کوئی پکارتا ہے۔ "فائر بریگیڈ" منیجر دوڑتا ہوا آتا ہے۔ بڈھوں کو اُٹھاتا ہے۔ پولیس کو آواز دیتا ہے۔ لفنگوں میں سے ایک آدھ کے جھانپڑ رسید کرتا ہے تھوڑی دیر میں امن ہو جاتا ہے

ایک آواز :۔ معاذ اللہ کی پناہ۔

دوسری آواز :۔ ارے بھائی لعنت بھیجو۔ تقریر سنتے سنتے تو کان پک گئے۔

ایک گرہ کٹ :۔ اس کا مزہ تو یار کمپنی باغ میں ہے۔

ایک بے فکرا :۔ کمپنی باغ کا کیا کہنا۔ "گانے لگتا ہے"۔ "سجنی کے لئے تن من دھن ہے"

ایک بچہ :۔ (رو کر) اماں پانی۔

ماں :۔ چپ رہ۔ پانی پانی، جب دیکھو پانی۔ میاں گلچھرے اُڑا ئیں۔ میں دن رات ہلکان ہوں۔ آگ لگے ایسے پانی کو۔ پانی پانی۔ دن رات پانی۔

ریڈیو :۔ ہندوستان کی نجات اس وقت تک نہیں ہو سکتی ......"

ایک آواز :- اماں کچھ اور لگاؤ، ہندوستان کی نجات کو ہم سے کیا جب گھر والی سے نجات نہیں تو پھر کیسی کوئی اور نجات - واہیات -

ایک عورت :- کلموا ---- ریڈیو نے گھڑگھڑا کر گت بدلی -

اندراں دروے کہ در دل بود، در اں یافتن
در حجاب زلف جاناں، نور ایماں یافتن

ایک قلندر :- ہُو - حق -

ایک شاعر :- کیا بات ظالم نے کہی ہے ---- نور ایماں یافتن -

ایک صاحب :- ہوش میں آؤ - سوپ ایسے کان ہیں، لیکن سنائی نہیں دیتا - نور ایماں بافتن نہیں، یافتن ہے

شاعر :- ہوش میں آؤ - تم حسن کلام کیا جانو - زلف کے ساتھ بافتن ہی ٹھیک ہے - واہ وا -

معترض :- اور نور ایمان ؟

ایک آواز :- چُپ بے بے ایمان -

ایک بے فکرا :- ارے بھائی جانے دو - نور بافت کا بھی تو کوئی حق ہے -

ایک آواز :- یار کچھ اور لگاؤ - یہ آداب تسلیمات قسم کا گانا کون سُنے - (ریڈیو میں گھڑگھڑاہٹ)

اناؤنسر :- اب پٹیالے والے عاشق علی خاں صاحب گو سارنگ کا خیال تُرت لے میں گائیں گے - آ - آ - آ - (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) آ - آ - آ (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) بھو - بھو - بھو -

ایک بزرگ :- سبحان اللہ اپنے فن کا امام ہے - اب یہ لوگ کہاں اور یہ فن کہاں -

ریڈیو :- بھو - بھو - بھو - آ - آ - آ ...... (مجمع میں غلغلہ شارہ اور چیخ و پکار)

منیجر دوڑتا ہوا آیا اور پکارا "ارے ریڈیو کس نے بگاڑا"

ایک صاحب :- جناب گھوڑ سا رن ہے - (ریڈیو کی چابی بدل گئی)

اناؤنسر نے اعلان کیا :- "اب طمنچہ جان ایک غزل سنائیں گی"

ایک آواز :- جزاک اللہ کیا تاریخی نام ہے -

دوسری آواز :- کیا ہندو مسلم اتحاد کا پہلو نکالا ہے -

تیسری آواز :- جی اور کیا مسجد بھی ہے باجا بھی ہے

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی
عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی

ایک آواز :- کیا پُر تاثیر شعر ہے

دوسری آواز :- کیوں نہیں - اور بھئی جوانی تو لٹا دینے کی چیز ہی ہے (گاکر) آؤ پیا سونی لاگے سیجر!

ایک بڈھا :- سرد آہ کھینچ کر، رہے نام اللہ کا - اب عناصر میں اعتدال کہاں -

ایک نوکر :- رام رام جپنا - پرایا مال تکنا -

اخبار بیچنے والا لڑکا :- چین میں چیاؤں پیاؤں - چیمبرلین کی چھتری -

پھیری والا :- ہر مال چھ پیسے کا - ہر مال چھ پیسے کا -

منیجر کی گرجدار آواز :- ارے نکالو اس اخبار بیچنے والے لونڈے اور بساطی کو - ہوٹل میں لڑائی کا مول تول ٹھیک نہیں

(ریڈیو کی گھنڈی گھمائی گئی - آواز آتی ہے) "آپ جتن خانم اُمورِ خانہ داری پر تقریر فرمائیں گی"

"گھر کی بیویوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں"

ایک بے فکرا :- ارے فتو اُستاد، یہ عورتیں ریڈیو پر گھر گرہستی کا کھڑاگ پھیلاتی ہیں - برسات میں آئے کچھ چٹ پٹی سلونی بات

فتو اُستاد :- ابے لمڈے کبھی تو کام کی بات سُن لیا کر گھر والی میں کیا کیڑے پڑے ہیں - یہی لچھن ہیں تو بیٹا بھیک مانگو گے اور بھونی بھانگ نہ ملے گی -

بے فکرا :- اُستاد تم تو سٹھیا گئے ہو - اپن نے کیا کہا جو لگے اول فول بکنے -

فتو اُستاد :- چپ بے نہیں دیتا ہوں ایک لپوٹا بتیسی پیٹ میں گھس جائے گی -

(بہت سی آوازیں) جانے دو اُستاد جانے دو - لونڈا ہے کیا جانے بھلے مانسوں میں بندھا ہو تو جانے - (بے فکرے سے مخاطب ہوکر) اِدھر آ بے اِدھر آ - اُستاد کے سامنے کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ)

بے فکرے نے کان پکڑ کر اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا -

ایک آواز :- ایک دو - تین -

دوسری آواز :- تاک دھنا دھندن - تاک دھنا دھندن تال

بچے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں -

ریڈیو سے آرکسٹرا بجتا ہے - جو اسی اٹھک بیٹھک کے وزن پر ہے -

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ایم - اے

مرزا ابوالحسن آصف خاں

(مسلسل)

آصف خاں اور نور جہاں میں کشیدگی

شہریار نور جہاں کا داماد تھا اور نور جہاں کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی وہ شہریار کے لئے میدان صاف کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ شاہجہاں کی جگہ وہی شہنشاہِ ہند ہو اسی لئے شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان اس نے اختلاف پیدا کرایا اور معمولی معمولی باتوں پر اس قضیہ کو بڑھاتی رہی، اگرچہ آصف خاں نہایت سمجھدار دور اندیش اور محتاط تھا اور وہ ان سب سازشوں کو دیکھ رہا تھا لیکن بمقتضائے احتیاط خاموش تھا تاہم شاہجہاں کو اس کی بیٹی منسوب تھی اس لئے مخالفین کو قدرتی طور پر اس کے خلاف سازشیں کرنے کا موقعہ میسر تھا چنانچہ ان کو اس ناپاک مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل ہوگئی اور آصف خاں شاہجہاں کی جانب داری میں متہم ہوگیا۔ نور جہاں بھی اُس سے منحرف ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا جب آصف خاں کی ماں اور باپ اعتماد الدولہ کا تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے انتقال ہوچکا تھا، اس لئے نور جہاں کے دل میں بھائی کی طرف سے جو غبار پیدا ہوگیا تھا اس کا رفع کرنے والا بھی اب کوئی نہ تھا۔ حقیقت میں یہ نور جہاں کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ایسے دانشمند اور تجربہ کار بھائی کو جو حکومت کا رکن رکین تھا اور ممکن تھا کہ اس گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا، اپنا مخالف بنا لیا۔ نور جہاں کے دل میں آصف کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور وہ اُسے اپنے مقاصد میں مخل سمجھ رہی تھی ساتھ ہی وہ شاہجہاں کو باغی قرار دیکر اس کی تنبیہ بھی کرنا چاہتی تھی بعض مشیروں نے یہ رائے دی کہ آصف خاں اور مہابت خاں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں اگر مہابت خاں کو جو بہادر اور صاحب فوج ہے شاہزادہ پرویز کے ساتھ شاہجہاں کے مقابلہ پر بھیجدیا جائے تو وہ ضرور اس مہم کو درست طریقہ پر انجام دے گا، نور جہاں نے چند فرمان مہابت خاں کی طلب میں کابل بھیجے، مہابت خاں تجربہ کار اور جہاندیدہ جرنیل تھا وہ بیگم کی ان کارروائیوں کو پسند نہ کرتا تھا بلکہ خود نور جہاں کی طرف سے متوہم تھا، اسی لئے اس مہم پر جانا نہ چاہتا تھا تاہم اس نے لکھا کہ شاہجہاں کو باعثِ فتنہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کا استیصال مدنظر ہے تو پہلے اس فساد کی جڑ پر کلہاڑی چلائی

جائے یعنی آصف خاں کو حضوری سے الگ کر دیا جائے میں ایسی شرط پر دربار میں آنے کی جرأت کر سکتا ہوں یہ درخواست فوراً منظور ہو گئی اور آصف خاں کو خزانہ لانے کے حیلہ سے آگرہ بھیجدیا گیا، یہ وقت بہت نازک تھا آصف خاں آگرے سے تمام روپیہ، اشرفیاں اور سونا چاندی جو اکبر کے آغاز سلطنت سے وہاں رکھی ہوئی تھی لے کر لاہور جانا چاہتا تھا اور صورت یہ تھی کہ شاہجہاں کو خزانہ کے منتقل ہونے کی اطلاعات مل چکی تھیں، وہ خزانہ پر قبضہ کرنے کے خیال سے مانڈو سے آگرہ کی طرف چل پڑا تھا بلکہ فتحپور پہونچ چکا تھا اگر آصف خاں اسوقت خزانہ لے کر روانہ ہوتا تو یقیناً شاہجہاں سے اس کا مقابلہ ہو جاتا اسوقت یا تو وہ داماد پر تلوار اُٹھاتا یا خزانہ اسکے حوالے کر دیتا اور یہ دونوں صورتیں اچھی نہ تھیں لہٰذا اس نے بڑی دانائی اور دور اندیشی سے کام لیا کہ جہانگیر کی خدمتمیں عرضی بھیجدی کہ شاہجہاں خزانہ پر قبضہ کرنے ادہر آرہا ہے اسوقت حلقہ سے خزانہ کا نکالنا مناسب نہیں ہے، میں خزانہ کو خدا کے سپرد کر کے حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔

اب شاہی دربار میں شاہجہاں کے استیصال کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں کابل سے مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز کو اس کے مقابلہ کے لئے بلایا گیا تھا بادشاہ دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھا شاہجہاں کے نام احکام جاری ہو رہے تھے کہ دکن واپس جائے وہ درخواست کرتا تھا کہ پہلے حضور میں آکر مجھے اپنے جرائم معاف کرانے دیجئے پھر کہیں جاؤں گا مفسدوں نے شاہجہاں کی اس ضد کو جو سراسر خلوص و اطاعت پر مبنی تھی بغاوت اور سرکشی پر محمول کیا نورجہاں نے اس خیال کو تقویت دیکر جہانگیر کو بیٹے کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا نوبت یہاں تک پہونچی کہ باپ بیٹے کی فوجوں میں لڑائی ہوئی اگرچہ جنگ کی ترتیب مہابت خاں کی رائے سے ہوئی تھی مگر آصف خاں بھی بادشاہ کی طرف سے تلوار میان سے نکالے داماد کے مقابلہ میں میدان میں آیا اس نے شاہجہاں کے لشکر کو شکست دیکر پیچھے ڈھکیل دیا صرف یہی نہیں کہ باپ بیٹے کی جنگ میں آصف خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا بلکہ اس کا دوسرا داماد اور شاہجہاں کا ہم زلف صفی خاں بھی بادشاہ کی خیر خواہی میں جان لڑا رہا تھا جس کی بدولت اُسے ہفت صدی سے سہ ہزاری کیا گیا اور سیف خاں کا خطاب دیا گیا لیکن آصف خاں کی یہ تمام خدمات اور جاں نثاریاں محض اس بنا پر کہ وہ شاہجہاں کا خسر ہے کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں اور نورجہاں کا مقصد ہی یہ تھا کہ آصف خاں دربار سے دور رہے چنانچہ اٹھارھویں سن جلوس ۱۰۳۲ھ میں آصف خاں کو بنگالہ و اُڑلیسہ کی صوبہ داری پر نامزد کر کے خلعت خاصہ اور شمشیر مرصع عنایت کی گئی اس کے لڑکے ابوطالب کو دوہزاری منصب دیکر باپ کے ساتھ کیا گیا۔[1] لیکن یہ وقت وہ تھا جب مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز نے شاہجہاں کو دکن کی سرزمین سے نکال دیا تھا اور وہ بنگالہ کا رخ کر چکا تھا ایسی حالت میں آصف خاں کا بنگالہ

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۳۶۹

جانا نورجہاں کے سیاسی مقاصد کے بالکل ہی خلاف تھا چنانچہ آصف خاں کو اس بہانہ سے کہ پھوپی کو بھتیجے کی جدائی بہت شاق ہے واپس بلالیا[1]۔ آخر شاہجہاں نے جو نورجہاں کا اصل حریف تھا شکست کھا کر باپ سے استدعائے معافی کی جہانگیر نے بیٹے کو معاف کیا اور یہ قضیہ اس طرح طے ہوگیا مہابت خاں کو اس سے پہلے شاہزادہ پرویز سے جدا کر کے بنگالہ بھیجدیا گیا تھا اور اس کی جگہ خان جہاں مقرر ہوچکا تھا، یہ کارروائی بھی نورجہاں کے ایما اور اشارے سے ہوئی تھی پرویز کے پاس غالباً ایسے زبردست جرنیل کا رکھنا خلافِ مصلحت تھا چنانچہ آصف خاں اور خدائی خاں کو پرویز کے پاس بھیجکر مہابت خاں کو بنگالہ روانہ کرادیا گیا۔

آصف خاں اور مہابت خاں

مہابت خاں نے بنگالہ پہونچکر وہاں کی رعایا اور امراء پر بہت مظالم کئے بادشاہی دیوانوں اور متصدیوں کو بھی سرزمین بنگال سے نکال دیا رعایا نے جہانگیر سے فریاد کی، اب حالات اور تھے اگرچہ نورجہاں جس کے اشارے سے مہابت خاں نے شاہجہاں کو مصائب میں مبتلا کیا تھا دربار پر چھائی ہوئی تھی لیکن جہانگیر باوجود اس کے کہ نورجہاں سے بے انتہا محبت کرتا تھا فریادیوں کی درخواستوں پر بہت توجہ کرتا تھا، جب اس قسم کی درخواستیں پیش ہوئیں تو آصف خاں نے اسکے مظالم کو خوب بڑھا چڑھا کر بادشاہ کے سامنے بیان کیا اُسے انتقام کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا تھا مہابت خاں کی شکایات میں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ اس نے محلات شاہی پر بھی تصرف کیا ہے، چنانچہ ایک افسران شکایات کی تحقیقات کے لئے بنگال بھیجا گیا اُسے حکم تھا کہ تحقیقات کے بعد مہابت خاں کو خزانہ اور ہاتھیوں سمیت دربار میں لے آئے۔

یہ سب کچھ آصف خاں کی ہدایت سے ہو رہا تھا مہابت خاں نے ہاتھی اور خزانہ بھیجدیا مگر خود نہ آیا اپنے آنے کے لئے مہلت کا طالب ہوا، آصف خاں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا اور جانتا تھا کہ آصف خاں اس کی عزت و آبرو کے درپے ہے اس نے پانچ ہزار بہادر راجپوت ملازم رکھے اور دو مہینے کے بعد فوجی سازوسامان درست کر کے آگیا۔

اس درمیان میں آصف خاں کے اشارے سے بنگال کے ہزاروں فریادی آگئے جو مہابت خاں کی زیادتیوں پر بادشاہ کو متوجہ کرتے تھے، لیکن مہابت خاں پوری تیاری کے بعد آیا تھا اُس کا زیر کرنا آسان نہ تھا۔ بادشاہ کو مہابت خاں کے آنے کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جب تک شاہی مطالبات ادا نہ ہوں اور فریادیوں کی تکالیف رفع نہ ہوں، انصاف یہ ہے کہ مہابت خاں کو دربار میں آنے نہ دیا جائے، نورجہاں نے سفارش بھی کی لیکن بادشاہ عدالت کے معاملہ میں بہت سخت تھا اس نے اپنے حکم کو تبدیل نہ کیا۔

---

[1] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳

شاہی ضابطہ یہ تھا کہ کوئی امیر اور منصبدار اپنی اولاد کی شادی بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ کر سکتا تھا مہابت خاں نے اپنی لڑکی کا عقد ایک نقشبندی بزرگ زادہ سے اذنِ شاہی کے بغیر ہی کر دیا آصف خاں نے اس امر کو اسکے غرور، اور رعونت پر محمول کر کے بادشاہ کے گوش گزار کیا اور مہابت خاں کے داماد برخوردار کو گرفتار کر کے قید کر دیا، جہیز کا سامان بھی ضبط ہو گیا، اس موقعہ پر آصف خاں اگرچہ اپنی تمام سازشوں میں کامیاب ہو رہا تھا لیکن اسنے مہابت خاں کو پہچاننے میں سخت غلطی سے کام لیا اور اس کے معاملہ کو معمولی معاملہ سمجھ لیا مہابت خاں ایک زبردست، تجربہ کار، اور دور اندیش سپہ سالار تھا وہ آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔

اسوقت جہانگیر کابل جا رہا تھا اور دریائے بہٹ (اٹک) کے کنارے خیمے لگے ہوئے تھے دریا پر پل باندھ دیا گیا تھا تاکہ فوج کے گزرنے میں کوئی دشواری حائل نہ ہو بادشاہ کے کوچ سے ایک روز قبل حسب دستور تمام امراء نے دریا کو عبور کیا آصف خاں، فدائی خاں، خواجہ ابو الحسن اور جملہ امیر دریا پار چلے گئے، جہانگیر اور نورجہاں چند افسروں کے ساتھ ادھر رہ گئے۔

آصف خاں نے ایسی مجرمانہ غفلت سے کام لیا کہ مہابت خاں کا کچھ خیال ہی نہ کیا اور دریا کو عبور کر کے عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا۔ مہابت خاں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر سات آٹھ ہزار سوار ہمراہ لئے اور رات کے آخری حصہ میں حکم دیا کہ شور و غل مچائے بغیر بہت خاموشی سے دو ہزار سوار پل پہ چلے جائیں۔ اِدھر سے کوئی اُدھر جانا چاہئے تو اُسے نہ روکیں البتہ اُدھر کا آدمی اِدھر نہ آنے پائے اگر زیادہ شورش ہو تو فوراً پُل میں آگ لگا دی جائے، پھر چار پانچ ہزار سوار ساتھ لیکر آپ خیمۂ شاہی کی طرف گیا۔ یہ انتظام پہلے ہی کیا جا چکا تھا کہ دریا پار سے حملہ ہو تو پل میں آگ لگا دی جائے تاکہ امداد کے ذرائع بالکل منقطع ہو جائیں، جسوقت مہابت خاں نے جہانگیر کے خیمہ کو گھیر اہے۔ بادشاہ آرام کر رہا تھا خواجہ سراؤں نے پیر دبا کر ہوشیار کیا کچھ لوگوں نے مہابت خاں کو خواب گاہ کے قریب آنے سے روکا مگر مہابت خاں کا سیلاب رکنے والا نہ تھا، بادشاہ تلوار لیکر اُٹھا مہابت خاں اس وقت قریب آچکا تھا، بادشاہ نے غضبناک ہو کر پوچھا مہابت نمک حرام یہ آنا کس قسم کا ہے؟

مہابت خاں ڈر گیا اور کورنش کے مقررہ آداب ادا کئے مخالفوں کی شکایت کی اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اپنے ہمراہیوں کو الگ کھڑا کر دیا آپ قدمبوس ہوا اور تین دفعہ بادشاہ کے گرد پھرا، پھر عرض کیا مجھے کامل یقین تھا کہ آصف خاں ذلت وخواری کے ساتھ مجھے ہلاک کرا دیگا اس لئے مجبوراً یہاں چلا آیا اگر مجھے قابلِ سیاست خیال فرمایا جائے تو یہیں قتل کرا دیا جائے مگر دشمنوں کے حوالہ نہ کیا جائے، بادشاہ نے خشمگیں ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھکر چاہا کہ اس کا کام تمام کر دے مگر میر منصور بدخشی نے ترکی زبان میں عرض کیا کہ غصہ کا

وقت نہیں ہے صرف تسلی کر دیجیے، مہابت خاں کے آدمی ہر طرف چھائے ہوئے تھے مگر وہ خوشامدانہ گفتگو کر رہا تھا، مہابت خاں نے بادشاہ سے سوار ہونے کو کہا بادشاہ نے کپڑے بدلنے کی غرض سے نورجہاں کے پاس جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور اسی حالت میں اپنا گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا مگر غیرتِ شاہی نے اس کے گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ دی، پھر بادشاہ اسپ خاصہ پر سوار ہوا دولت خانہ سے کچھ دور نکلنے پر مہابت خاں حوضہ دار ہاتھی لے کر آیا اور عرض کیا کہ شورش کا اندیشہ ہے بہتر یہ ہے کہ ہاتھی پر بیٹھکر شکارگاہ کی طرف تشریف لے چلئے بادشاہ ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ مہابت خاں کا ایک معتمد راجپوت ہاتھی کے آگے اور دو حوضہ کے پیچھے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران میں مقرب خاں بھی مہابت خاں کی اجازت سے بادشاہ کے قریب جا بیٹھا مقرب خاں کی پیشانی پر اس طوفانِ بے تمیزی میں ایک زخم بھی آگیا تھا جس سے خون بہ رہا تھا، خدمت پرست خواص بھی جس کے ہاتھ میں شراب خاصہ کا پیالہ تھا قریب پہونچ گیا اور راجپوتوں نے برچھے کی نوک سے بہت روکا مگر وہ بھی حوضہ کا کنارہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ نورجہاں کو معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی اور بہ تبدیل لباس جواہر خاں خواجہ سرا کے ساتھ پل سے گزر کر دریا کے اس پار اپنے بھائی آصف خاں کے پاس چلی گئی، آصف خاں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے حواس پراگندہ ہو گئے۔

مہابت خاں ہاتھی کو اپنے خیمہ کی طرف لے گیا اور بڑے احترام سے بادشاہ کو اپنے خیمہ میں اُتارا اب مہابت خاں کو نورجہاں کا خیال آیا فوراً ہی معلوم ہوا کہ وہ آصف خاں کے پاس چلی گئی مہابت خاں کو یہ سنکر اپنی غفلت پر بہت افسوس ہوا پھر مہابت خاں بادشاہ کو شہریار کے خیمہ میں لے گیا۔

اگرچہ مہابت خاں بہت ہی آزمودہ کار فوجی افسر تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کرنے کو تو اس نے یہ کام کر لیا تھا مگر اس کے حواس بجا اور عقل ٹھکانے نہ تھی کچھ بن نہ پڑتا تھا اس کے آدمی خیمے کو گھیرے کھڑے رہتے تھے اور وہ خود دست بستہ بادشاہ کے سامنے حاضر رہتا تھا لیکن بادشاہ پر کسی قسم کا خوف یا رعب نہ تھا وہ بڑے ضبط و استقلال کا اظہار کر رہا تھا مہابت خاں مقررہ وقت پر بادشاہ کو تخت پر بٹھاتا اور شراب بھی پلاتا تھا غرض نہایت فرمانبرداری کا اظہار کرتا تھا آصف خاں نے تمام امراء کے مشورہ سے طے کیا کہ صبح کو لڑ بھڑ کر بادشاہ کو مہابت خاں کی قید سے چھڑا لینا چاہیے، جہانگیر نے مہابت خاں کے کہنے سے نورجہاں اور آصف خاں کو اس ارادے سے باز رہنے کی تاکید کی، اور مقرب خاں کے ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ میرے مقابلہ میں تم لوگوں کا جنگ کرنا زیبا نہیں میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔

مہابت خاں نے آصف خاں کو لکھ دیا کہ تم بڑے عقلمند بنتے تھے محض تمہاری وجہ سے بادشاہ کا یہ حال ہوا بہتر یہ ہے کہ وزارت مجھ پر چھوڑ دو میں بادشاہ کی خدمت کروں گا تم پنجاب اپنی جاگیر پر چلے جاؤ، آصف خاں نے

اس خیال سے کہ یہ سارے نامہ و پیام مہابت خاں کی رائے سے ہو رہے ہیں بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور لڑنے مرنے پر تیار ہو کر پل پر آیا مگر راجپوتوں نے فوراً آگ لگا دی بہادروں نے دریا میں گھوڑے ڈال دئے بہت سے ڈوب گئے کچھ خستہ حال کنارے پر پہونچے۔ خدائی خاں نے سات آدمیوں کے ساتھ مہابت خاں کی فوج سے جنگ کی مگر پھر دریا کو تیر کر چلا گیا۔

آخر آصف خاں نے سب امیروں کو ہمراہ لے کر نور جہاں کو ہاتھی پر سوار کیا اور ایک پایاب گھاٹ سے دریا کو عبور کیا لیکن جس گھاٹ سے فوج اُتر رہی تھی وہاں دو تین غار تھے اس لئے فوج میں برہمی پیدا ہو گئی۔ آصف خاں بھی نور جہاں کی عماری سے جدا ہو گیا، آصف خاں خواجہ ابوالحسن اور نور جہاں ابھی دریا سے نکلے نہ تھے کہ مہابت خاں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اس حملہ سے فوج بے ترتیب ہو گئی کچھ لوگ دریا سے اُتر آئے کچھ دریا ہی میں رہے کچھ لوٹ گئے۔ نور جہاں کا ہاتھی تیر کر نکل آیا اور وہ بادشاہ کے پاس چلی گئی آصف خاں کا بیٹا ابو طالب اور چند دوسرے نامور سردار بھی آ گئے خدائی خاں لڑتا بھڑتا راجپوتوں کو سامنے سے ہٹا کر خیمۂ شاہی تک پہونچ گیا خدائی خاں پر اسوقت سخت یورش تھی ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، اس کے تیر خیمہ میں بادشاہ کے قریب جا کر گر رہے تھے مخلص خاں سامنے آ گیا۔ مہابت خاں نے کہا اس کم بخت کی جرأت ملاحظہ فرمایئے کہ اپنے آقائے ولی نعمت پر تیر چلا رہا ہے بادشاہ نے بہت پیام بھیجے کہ اس کوشش سے باز آؤ مگر اس نے ایک نہ سنی، مہابت خاں کی فوج برابر اس کے مقابلہ میں جمی ہوئی تھی مگر اسکی امداد کو کوئی نہ آتا تھا بلکہ اسے لڑائی سے روکا جا رہا تھا مجبور ہو کر وہ پھر دریا کو عبور کر کے واپس ہو گیا۔

آصف خاں کی گرفتاری

آصف خاں نے دیکھا کہ کوئی کام نہیں بنتا اور یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے مہابت خاں انتقام لئے بغیر نہ چھوڑے گا اس لئے وہ اٹک چلا گیا جہاں اس کی جاگیر تھی بہت سے امرا مہابت خاں سے معافی کا وعدہ لے کر اس کے پاس چلے گئے، آصف خاں بھاگ کر اپنے ڈھائی سو ہمراہیوں کے ساتھ اٹک کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا، مہابت خاں نے راجپوتوں کی فوج اس کے تعاقب میں بھیجی پھر نور جہاں کو بادشاہ کے پاس چھوڑ کر اس نے اپنی آدھی فوج کو بادشاہ کی حفاظت پر مامور کیا اور نصف فوج ساتھ لے کر وہ آصف خاں کے پیچھے گیا۔ آصف خاں کے ساتھی مہابت خاں سے مل گئے اور مہابت خاں، آصف خاں اور اس کے بیٹے ابو طالب کو قید کر کے بڑی بے آبروئی سے بادشاہ کے پاس لایا۔

بادشاہ مہابت خاں کے خوش کرنے کو اکثر نور جہاں اور آصف خاں کی بُرائی کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ نور جہاں نے بہت فساد مچا رکھا ہے اور میری محبت ظاہری سے فائدہ اُٹھا کر شاہجہاں کو میرا مخالف بنا دیا۔

اب میں ان دونوں بھائی بہنوں کا منھ دیکھنا نہیں چاہتا یہ ساری گفتگو نورجہاں کے مشورے سے ہوا کرتی تھی۔

آصف خاں کی رہائی

نورجہاں کی حسن تدبیر سے جب بادشاہ مہابت خاں کی قید سے رہا ہوا اور مہابت خاں بھاگ گیا تو بادشاہ نے افضل خاں کو اس کے پاس بھیجکر پیام دیا کہ آصف خاں اور اس کے لڑکے ابوطالب اور دانیال کے بیٹوں کو ہمارے پاس بھیجدو تو تمہارا قصور معاف کردیا جائے گا۔ مہابت خاں نے دانیال کے بیٹوں کو افضل خاں کے حوالہ کردیا آصف خاں کی نسبت یہ عذر کیا کہ نورجہاں سے مجھے اطمینان نہیں ہے جب تک میں لاہور سے نہ گزر جاؤں آصف خاں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بادشاہ نے پھر افضل خاں کو بھیجا اور اپنے اور نورجہاں کی طرف سے قسموں کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ میرے یا بیگم کے ہاتھ سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہونچے گا مہابت خاں پہلے ٹالتا رہا پھر تین چار منزل کے بعد آصف خاں کو بلا کر عہد لیا اور خلعت، گھوڑا وغیرہ دیکر بادشاہ کے پاس بھیجدیا، مگر ابوطالب کو اپنے پاس رکھا جب اطمینان ہوگیا کہ فوج اس کے تعاقب میں مقرر نہیں ہوئی تو ابوطالب کو بھی عزت کے ساتھ رخصت کردیا۔[1]

وزارت

آصف خاں کی رہائی کے بعد سنہ ۱۰۳۶ھ میں کابل سے واپس ہوتے وقت لاہور پہونچکر اسکو پنجاب کی صوبہ داری اور عہدۂ وزارت پر مامور کیا گیا اسکے بعد ہفت ہزاری عہدہ (ہفت ہزار سوار) کیا گیا۔[2]

جہانگیر کا انتقال اور آصف خاں کی سرگرمیاں

۲۸ صفر سنہ ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے کشمیر سے لاہور آتے ہوئے انتقال کیا اسی حادثہ سے قبل شہریار جس کو نورجہاں مسندِ خلافت پر بٹھانا چاہتی تھی، داء الثعلب میں مبتلا ہوگیا اور مونچھوں، ابرو، اور پلکوں کے بال بالکل جھڑ گئے، صاحب مآثر الامراء کا بیان ہے کہ آتشک کی وجہ سے یہ عارضہ پیدا ہوا تھا بہرحال وہ کچھ تو شرم کی وجہ سے اور کچھ علاج کرانے کی غرض سے لاہور چلا آیا تھا۔ جہانگیر کا پوتا یعنی خسرو کا بیٹا داور بخش قید میں تھا۔

نورجہاں نے اپنے بھائی آصف خاں کو جہانگیر کی تجہیز و تکفین اور معاملات ملکی میں مشورہ کرنے کی غرض سے اپنے پاس طلب کیا لیکن آصف خاں نہ گیا اور داور بخش کو قید سے نکال کر بادشاہ بنا دیا اسی کے ساتھ اسنے ایک ہندو کو جس کا نام بنارسی تھا اور نہایت تیز رو تھا اپنی انگوٹھی دیکر شاہجہاں کے پاس بھیجا اور بہت جلد آنے کا زبانی پیام دیا۔[3]

---

[1] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۳ و تورک جہانگیری جلد دوم ——— [2] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۳ و تورک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔
[3] مآثر الامراء ۱۵۴ و تورک جہانگیری جلد ۲۔

نورجہاں کی نظربندی نورجہاں شہریار کی سلطنت کے لئے تدبیریں کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ آصف خاں اور اعظم خاں میر بخشی کو اپنے یہاں بلاکر قید کر دے آصف خاں کی دوسری بہن صادق خاں کے عقد میں تھی وہ بھی نورجہاں کا شریک کار تھا، نورجہاں نے چند بار آصف خاں کو بلایا مگر اس نے عذر کر دیا آصف خاں آگے آگے لاہور کی طرف آ رہا تھا نورجہاں پیچھے پیچھے جہانگیر کی نعش کے ساتھ آ رہی تھی دوسرے دن بھینبر میں قیام ہوا اور جہانگیر کی تجہیز وتکفین کر کے نعش کو آگے روانہ کر دیا گیا تاکہ لاہور میں باغ نورجہاں میں اس کو دفن کر دیا جائے ہر شخص سمجھتا تھا کہ آصف خاں یہ جو کچھ کر رہا ہے سب شاہجہاں کے لئے ہے داور بخش کو زبردستی قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اس لئے تمام امرا اس کی فرمانبرداری کر رہے تھے لیکن نورجہاں اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھی اس لئے آصف خاں نے نورجہاں اور اپنی دوسری بہن اہلیہ صادق خاں کے گھر پر نگرانی کے لئے پہرے بٹھا دئے اور آدمیوں کی آمد و رفت بند کر دی بلکہ نورجہاں کو شاہی محل سے لاکر اپنے گھر میں رکھ لیا، چنانچہ مآثر الامراء میں ہے

"بلکہ گویند بیگم را از محل بادشاہی برآوردہ در منزل خود جا داد[1]"

شہریار سے مقابلہ شہریار نے لاہور میں جہانگیر کے مرنے کی خبر سنی تو شاہی خزانوں اور کارخانوں پر متصرف ہو کر بادشاہی کا دعوے کیا اور لشکر جمع کرنے کے لئے اس نے خزانوں کا منہ کھول دیا چنانچہ ایک لاکھ روپئے صرف کر کے ایک ہفتہ میں کافی لشکر جمع کر لیا اور مرزا بایسنقر خاں ولد دانیال کو جو جہانگیر کے مرنے پر بھاگ کر شہریار کے پاس آگیا تھا۔ اس کا سپہ سالار بنایا، بایسنقر خاں لشکر لیکر راوی کے پار آیا اور شہریار دو تین ہزار سواروں کے ساتھ شہر لاہور کے باہر لڑائی کے نتیجہ کا منتظر رہا۔

اس طرف سے آصف خاں بڑی شان وشوکت سے داور بخش کو ہاتھی پر بٹھا کر چلا ایک ہاتھی پر وہ خود سوار ہو کر قلب لشکر میں قایم ہوا لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پر مقابلہ ہوا پہلے ہی حملہ میں بایسنقر خاں کو شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ شہریار شکست کی خبر پاکر قلعہ میں چلا گیا۔

شہریار کی گرفتاری اگلے دن آصف خاں نے قلعہ کے قریب ہی خیمے نصب کئے شہریار کے اکثر ساتھی آصف خاں سے آملے اور رات کے وقت کچھ لوگ ان کی امداد سے قلعہ میں داخل ہو گئے اور داور بخش کو تخت پر بٹھا دیا شہریار جہانگیر کی حرم سرا کے ایک کونہ میں چھپا ہوا تھا فیروز خاں خواجہ سرا نے اس کو پکڑ کر الہ وردی خاں کے سپرد کیا اس نے اس کی کمر کا پٹکہ کھول کر دونوں ہاتھ

---

[1] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۵

باندھے اور داور بخش کے سامنے حاضر کر دیا وہاں اُسے پہلے قید کیا گیا پھر دو دن کے بعد آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔[۵۱] پھر چند دن کے بعد طہمورث اور ہوشنگ پسران دانیال کو بھی گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔

آصف خاں نے فتح کی مسرت افزا نوید شاہجہاں کی خدمت میں بھیجی شاہجہاں کو ساہوکاروں کے خطوط سے یہ حالات معلوم ہو گئے تھے اس نے خدمت پرست خاں، رضا بہادر کو احمد آباد سے آصف خاں کے پاس لاہور بھیجا، اور اپنے ہاتھ سے یہ خط لکھا کہ مصلحت وقت کا تقاضہ ہے کہ داور بخش اور دوسرے شاہزادوں کو قتل کر دیا جائے چنانچہ آصف خاں نے ۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو اتوار کے دن داور بخش کو قید کر کے شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا اور ۲۶ جمادی الاول کو گرشاسپ اور اس کے بھائی، نیز شہریار، طہمورث اور ہوشنگ پسران سلطان دانیال کو قتل کر دیا۔[۵۲]

عہد شاہجہانی

شاہجہاں آگرہ میں اورنگ نشین حکومت ہوا تو آصف خاں لاہور میں تھا، شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے اس کو فرمان لکھا جس میں بہت سے القاب و خطابات کے بعد اپنی تخت نشینی کا وقت تحریر کیا، یہ بھی لکھا کہ آپ کے کہنے سے ہم نے اپنا لقب "شہاب الدین" مقرر کیا ہے، ساتھ ہی شوق ملاقات کا اظہار بھی کیا، اپنا وہ خلعت بھی آصف خاں کے لئے بھیجا جو جلوس کے دن پہنا تھا، اور آٹھ ہزاری منصب بندر لاہوری۔

آصف خاں دربار شاہجہانی میں

۲ رجب ۱۰۳۷ھ میں آصف خاں داراشکوہ، محمد شجاع اور اورنگ زیب کو ساتھ لے کر لاہور سے آگرہ آیا اور بادشاہ کے حکم سے سکندرہ میں مقیم ہوا، ممتاز محل بیٹوں سے ملنے گئی آصف خاں نے اس کا استقبال کیا، آصف خاں کو مہر اوزک جو ممتاز محل کے پاس رہتی تھی عنایت ہوئی اور وزارت کا منصب، یمین الدولہ کا خطاب ملا، گفتگو کے وقت بادشاہ لفظ عمو سے مخاطب کرتا تھا، آٹھ ہزاری منصب آٹھ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا، جو آج تک کسی امیر کو نہ ملا تھا اس کے بعد جب آصف خاں نے اپنی فوج کا معائنہ کرایا تو نو ہزاری کر دیا گیا اور نہایت آباد جاگیر جس سے پچاس لاکھ روپیہ وصول ہوتا تھا مرحمت کی گئی[۵۳]

آصف خاں کی سپہ سالاری

۱۰۳۹ھ میں نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال کی غرض سے فوج تعینات ہوئی جس کے ایک حصہ کی سرداری شائستہ خاں ولد آصف خاں کے سپرد تھی، اس فوج کا سپہ سالار اعظم خاں تھا۔ سپہ سالاری کا عہدہ نہایت اہم تھا فوج میں بڑے بڑے امیر اور سردار ہوتے تھے ان پر اثر قایم رکھنا آسان نہ تھا اور بغیر اثر و اقتدار کے فوجی مہمات کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں

---

[۵۱] ماثر الامرا صفحہ ۱۵۵ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۳۴۶ و اقبال نامہ صفحہ ۲۶۹ — [۵۲] ماثر الامرا صفحہ ۱۵۶ و توزک جہانگیری جلد دوم صفحہ ۴۳۹ و اقبال نامہ صفحہ ۲۷۲ — [۵۳] ماثر الامرا صفحہ ۱۵۶

معرکۂ جنگ وجدال میں فوج اور امراء پر اقتدار قائم رکھنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے اعظم خاں سپہ سالار تو ہوگیا مگر وہ سپاہ کو قابو میں نہ رکھ سکا امراء اس کی مساوات کا دم بھرنے لگے جس سے تنظیم میں فرق پڑ گیا، پھر اعظم خاں سے کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ وہ انعام یا منصب عطا کر سکتا ہے بادشاہ نے یہ کیفیت دیکھ کر برہان پور میں یمین الدولہ آصف خاں کو سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کیا۔

عادل شاہ کی گوشمالی ۱۰۴۱ھ میں آصف خاں برہان پور سے محمد عادل شاہ بیجاپور کی گوشمالی کے لئے بڑے تزک واحتشام سے زبردست فوج لے کر روانہ ہوا حوالی بیجاپور میں اس نے خیمے لگائے اور مار دھاڑ شروع کی لیکن محمد امین مصطفےٰ خاں اور خیریت خاں چالیس لاکھ روپے کی پیشکش لیکر قلعہ سے نکلے اور صلح کرلی، لیکن خواص خاں جو اسوقت سلطنت بیجاپور کا کرتا دھرتا تھا وہ جانتا تھا کہ ملک ویران ہے اور لشکر شاہی میں غلّہ، گھاس، لکڑی اور دوسرے سامان رسد کی قلت ہے ایسی حالت میں آصف خاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا اسلئے وہ بدستور مدافعت میں مصروف رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ لشکر میں نہ صرف غلّہ ہی کا قحط تھا بلکہ تمام ضروری چیزیں بھی نایاب تھیں حتیٰ کہ ایک جوڑ جوتے کی قیمت چالیس روپیہ تھی اور ایک گھوڑے کی نعلبندی میں دس روپئے صرف ہوتے تھے پھر یہ ملک بھی بالکل ویران تھا مجبوراً یمین الدولہ بیجاپور سے محاصرہ اٹھا کر رائے باغ اور مرج کی طرف قتل وغارتگری کرتا ہوا راہی ہوا۔ جو بہت آباد ملک تھا پھر برسات کے قریب کی وجہ سے واپس آگیا۔

آصف خاں سے شاہجہاں کی کشیدگی اس مہم کا ایک ناگوار واقعہ یہ ہے کہ ایک دن خلوت میں اعظم خاں نے آصف خاں سے کہا کہ بادشاہ کو اب میری اور آپ کی ضرورت نہیں ہے آصف خاں نے کہا میرے اور تمھارے بغیر سلطنت کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کو بھی کسی طرح اس گفتگو کا علم ہوگیا اور اس کو سخت ناگواری ہوئی فرمایا کہ آصف خاں کے مجھ پر بہت زیادہ احسانات ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ آیندہ امور سلطنت میں اُسے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

خان خانانی کا خطاب اگرچہ اس واقعہ کے بعد دونوں میں خلوص نہ تھا لیکن بظاہر آصف خان کی عزت وتوقیر میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی بلکہ مہابت خاں کے مرجانے پر ششم جلوس میں خان خانانی اور سپہ سالاری کا لفظ اس کے خطابات میں بڑھا دیا گیا۔

انتقال[1] ۱۷ شعبان ۱۰۵۱ھ کو آصف خاں نے مرضِ استسقا یعنی جلندر میں انتقال کیا۔

"زہے افسوس آصف خاں" تاریخ وفات ہے۔

بادشاہ علالت کے دوران میں چند بار اسکے گھر گیا، بادشاہ کو اس کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا، آصف خاں کے بڑے بیٹے شائستہ خاں کو جو ان دنوں صوبۂ بہار کا ناظم تھا ماتمی خلعت اور فرمان تسلی بھیجا، آصف خاں کے دوسرے

[1] ماثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۸

بیٹوں اور بیٹیوں نیز بیگم صاحبہ (اپنی بیٹی، بادشاہ بیگم) کی دلجوئی کی سب کو بغیر سلے ہوئے نو کپڑوں کا خلعت دیا آصف خاں کے متعلقین میں جو شخص منصب کے لائق تھا اُسے منصب دیا گیا اور جو تنخواہ کے قابل تھا اُس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

شاہجہاں جب آصف خاں کی عیادت کو گیا تو اس نے علاوہ لاہور والی حویلی کے جسکی تعمیر پر بیس لاکھ روپئے صرف ہوئے تھے اور علاوہ ان مکانات کے جو دہلی آگرہ اور کشمیر میں واقع ہے دو کرور پچاس لاکھ روپئے کے جواہرات، چاندی، سونا اور اجناس بادشاہ کے سامنے پیش کر کے التجا کی کہ ان سب کو خزانۂ عامرہ میں داخل کر لیا جائے[1]۔ کیونکہ مال و دولت جمع کرنے کا مقصد سوا اسکے اور کوئی نہیں ہے کہ اولاد کے آرام و راحت میں کام آئے لیکن میرے اولاد اور اعزہ آپ کے فیضِ التفات سے خوش و خرم ہیں، ایسی صورت میں یہ مال و متاع خزانہ ہی میں داخل ہونا چاہئے۔

بعض کتابوں میں ان چیزوں کی یہ تفصیل لکھی ہے:- جواہر:- ۳۰ لاکھ روپئے کے ——

اشرفی:- ۳ لاکھ یعنی بیالیس لاکھ روپئے کی —— نقد:- ایک کرور پچیس لاکھ روپئے ——

سونے چاندی کے ظروف:- تیس لاکھ روپئے کے —— دوسری اجناس:- تیس لاکھ روپئے کی ——

بادشاہ نے اس میں سے بیس لاکھ روپئے اسکے تینوں بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کو تقسیم کر دئے، لاہور کا محل دارا شکوہ کو عنایت کیا گیا جو آصف خاں کا نواسہ تھا۔ باقی اشیاء ضبط کر لی گئیں[2]۔

مقبرہ آصف خاں کو شاہجہاں کے حکم سے جہانگیر کے روضہ کے غربی جانب دریائے راوی کے کنارے دفن کیا گیا قبر پر عالیشان گنبد تعمیر ہوا اور باغیچہ بھی نصب کیا گیا[3]۔

منشی کالے خاں صاحب نے "تاریخ عماراتِ شاہانِ مغلیہ" کے صفحہ ۱۱۹ پر مقبرۂ اعتماد الدولہ کے حالات میں لکھا ہے:-

"ایک گوشہ میں ابوالحسن یمین الدولہ آصف خاں کی قبر ہے جن کا منصب شاہجہاں بادشاہ کا عطا کیا ہوا نو ہزاری تھا وزیر اعظم بھی تھے اور شاہجہاں بادشاہ کے خسر بھی تھے ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء میں مرض استسقا سے انتقال کیا"

معلوم نہیں منشی صاحب موصوف کی اس تاریخی کاوش و جستجو کا ماخذ کیا ہے اور اس میں کہاں تک اصلیت ہے سن وفات تو منشی صاحب نے غلط لکھا ہے، آصف خاں ۱۰۵۱ھ میں فوت ہوا ہے، ۱۰۶۲ھ میں وہ زندہ و سلامت تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو کسی نے اُسے لاہور سے اُٹھا کر آگرہ میں باپ کی آغوش میں لا رکھا ہو مگر اُسی کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی نور جہاں بھی تو اعتماد الدولہ کی بیٹی تھی وہ لاہور ہی میں محو خواب ہے — ممکن ہے جہانگیر کی رعایت سے نور جہاں کو وہاں رہنے دیا گیا ہو، بہر حال میرے مطالعہ میں جسقدر تاریخی کتابیں ترتیب مضمون کے وقت رہیں ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ ابوالحسن لاہور سے آگرہ آ گئے تھے —— واللّٰہ اعلم بالصواب

کوثر چاندپوری

---

[1] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۰ — [2] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۸ و سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰ — [3] مآثر الامراء صفحہ ۱۵۸ و سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۲۷۰ —

سیفو

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :۔

"اگر دنیا کے تمام شعراء سے سوال کیا جائے کہ وہ کون سا بیش بہا خراج ہے جو زمانہ نے انسانی فطنت (جینیس) کی ظفرمندی کے ذریعے سے حاصل کیا، تو وہ بلا تامل اور متفقہ طور پر جواب دیں گے کہ سیفو کے گمشدہ اشعار!"

شیکسپیر کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مردوں میں ہومر برترین شاعر ہے، مگر سیفو بغیر استثنا عورتوں میں برترین شاعرہ ہے عجیب بات ہے کہ ہومر اور سیفو نہ صرف کمال فن کے اعتبار سے شعرائے عالم کے سرخیل ہیں بلکہ قدامت کے لحاظ سے بھی ہیں اور اس پہلو سے اُن کے کمال فن کا کما حقہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

سیفو کی مقبولیت کو دنیا کے کسی ملک اور کسی زمانے کا کوئی شاعر نہیں پہونچتا، کیونکہ دنیا میں کسی شاعر کی تصویر اُسکے ملک کے سکوں پر ٹھپا نہیں ہوئی۔ یہ اعزاز اور خصوصیت صرف سیفو کا مقدر تھا۔

دوسرا ثبوت سیفو کی عظمت اور مقبولیت کا یہ ہے کہ تین سو سال سے سیفو اور اُس کے کلام کے متعلق جستجو جاری ہے اور برابر مجتہدین فن داد تحقیق و تلاش دے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مکمل کتاب ۱۹۰۸ء میں مسٹر وہارٹن (Wharton) نے لکھی جسے سیفو کے باب میں "لفظ آخر" کا درجہ دیا گیا۔ مگر بیس سال پورے نہ ہونے پائے تھے کہ مسٹر ہینیز (Heines) نے ایک جامع تر تالیف پیش کر دی۔

سیفو کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لئے متعدد یورپی شعراء نے سیفو کے ایک ایک پارے کو لیکر پوری نظمیں لکھی ہیں جو دنیا کی تاریخ ادب میں نئی اور نرالی ادبی کاوش ہے۔ کسی شاعر کے خیال کو اُس کے ایک لفظ یا ٹکڑے سے اُس شاعر کی طرح تخئیل کرنا، اُسی کے ماحول میں احساس کرنا، اور اُس کی تخئیل و احساس کو اپنا لینا درحقیقت اہرام مصری کو آن واحد میں کھڑا کر دینے کے برابر مشکل کام ہے! گویا سیفو کے خوابوں کی تعبیر نہیں بیان کی گئی بلکہ اُسکے خواب خود دیکھے گئے! قطع نظر اس سے کہ ان شاعروں کو کس حد تک کامیابی ہوئی یہ مجرد واقعہ کہ سیفو کے ٹکڑے پر سیفو ہی کی زبان و انداز میں نظمیں کہی جائیں اور اُس کا رنگ اور سیرت پیدا کی جائے ایک کارِ عظیم و عجیب ہے!

چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف اول کا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک جشن دعوت میں یونان کا مشہور مقنن سولن بھی شریک تھا۔ سولن کے بھتیجے نے اُس صحبت میں سیفو کے بعض شعر پڑھے۔ سولن ان اشعار سے اس قدر متاثر ہو

کہ اُس نے وہ اشعار اُسی وقت یاد کئے اور پھر ایک سوال کے جواب میں کہنے لگا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور میں ان اشعار کو یاد کئے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔

دوسرا تاریخی واقعہ اس کے دو سال بعد کا ہے۔ ایکرامِیس (Apicematis) کے ڈرامہ کا ایک کردار فخر کرتا ہے کہ اُسے سیفو کا گیت یاد ہے! اس واقعے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اُس وقت کی سوسائٹی میں سیفو کے اشعار کا کیا درجہ تھا سسرو کے زمانے میں بھی سیفو کے گیت گائے جانا ثابت ہے اور پھر تیسری صدی عیسوی تک کی شہادت ملتی ہے کہ سیفو کے نغمے ذوق و انہماک کے ساتھ گائے جاتے اور انسانوں کو وجد میں لاتے تھے۔

اس کے بعد یقینی شہادت تو نہیں مگر ساتویں صدی عیسوی میں بھی سیفو کے نغمات کی مقبولیت کے اشارے ملتے ہیں کہ وہ بالکل محو نہیں ہوگئے تھے۔ کیونکہ اُس صدی کے نحویوں نے سیفو کے حوالے دئے ہیں۔

ایک اور خاص بات سیفو کی عظمت کے ضمن میں یہ ہے کہ ساتویں صدی کے بعد سے سیفو کا نام اور کلام محو ہوکر پندرھویں صدی کے آخر تک کہیں اُس کے متعلق اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن سولویں صدی میں اُس کی مقبولیت اور عظمت پھر اپنا مستحق مرتبہ پالیتی ہے!۔

ہومر کی طرح کسی شاعر کا کلام ہمیشہ مقبول و معزز رہ سکتا ہے، غالب کی طرح مردود ہو کر مقبول بھی ہوسکتا ہے اور نظیر کی طرح متصل مقبول بھی رہ سکتا ہے اور مردود بھی، لیکن یہ خصوصیت تنہا سیفو کو حاصل ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انتہا درجے پر مقبول رہنے کے بعد انسانی حافظے سے یکسر محو ہوجائے اور آٹھ صدیوں تک بالکل گمنام رہ کر پھر وہی عظمت و قبولیت حاصل کرلے۔

سیفو کی اخلاقی حالت اور اُس کے کردار کے متعلق دو باتوں نے سخت اُلجھن اور مغالطہ پیدا کردیا۔ ایک تو اس کا اپنی شاگردوں سے غیر معمولی اظہار محبت کرنا جو اُس کے موجود اشعار کا بھی غالب موضوع ہے اور خاص کر اُس کی وہ نظم جو سیفو نے اپنی شاگرد انفیس کو مخاطب کرکے لکھی ہے اور دوسری بات وہ خط ہے جس کو غیر مستند طور پر اووِڈ کی تصنیف کہا جاتا ہے، سیفو سے منسوب کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب فاؤن (Faon) کو لکھا تھا۔

فاؤن کے افسانے کا مسالا اصل میں بعض نحویوں کی تاویلوں کا نتیجہ ہے۔ سیفو کچھ دن مقام ارسیس میں بھی رہی تھی، اور وہاں اُس کی ہم نام ایک ڈیرہ دار (Courtezan) بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جب سیفو رسوا کی جانے لگی تو ان نحویوں میں سے کسی نے اِن داستانوں کو اُس ڈیرہ دار سیفو سے منسوب کردیا۔ یہ خیال شاید اس لئے پیدا ہوا کہ جس باکمال شاعرہ کے نام اور حوالے سے لوگ اپنے فن صرف و نحو کو معزز بناتے ہیں اُسے رسوائی سے بری ہونا چاہئے۔

مگر بعد کے یونانی طربیہ نگاروں نے جو تاریخ ادب میں ایٹک کامیڈین (Attic Comedian) کہے گئے اُن افسانوں کو لیکر متعدد ڈرامے لکھ ڈالے۔ اور پھر ناموں کی تمیز مٹ کر اُن داستانوں کو اُس ذات سے منسوب سمجھا گیا جو نہایت

مشہور تھی۔

قدیم زمانے کے جن لوگوں نے سیفو کے نام کو ذلت و رسوائی سے پاک رکھنے کی کوشش کی اُن میں سب سے پہلے فلسفی میکسی مس کا نام آتا ہے۔ وہ خود بھی اعلیٰ کردار اور شریفانہ اخلاق کا انسان تھا اور اُس کے خیال میں سیفو کا اپنی شاگرد لڑکیوں سے غیر معمولی محبت کرنا کوئی انہونی بات نہ تھی اور اُس کی یہ محبت اُس محبت سے مماثل تھی جو حکیم سقراط کو اپنے شاگردوں سے تھی یعنی میکسی مس، سقراط اور سیفو کی محبت کو معصوم سمجھتا تھا۔ اُس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ان دونوں کی رسوائی کی ذمہ دار اُن کی ہمدردانہ فطرتیں تھیں، اور کثرتِ احباب کے ساتھ اُن کی حسن پرست طبیعتوں کو غلط طور پر سمجھنے کا نتیجہ! وہ محض سیفو کے کلام سے اُس کے اخلاق و کردار کی بلندی ثابت کرتا اور بتاتا ہے کہ سیفو کا ایک بھائی جو اسکندریہ میں تھا، ایک ڈیرہ دار دوشیزہ (جس کا تاریخی لقب رہوڈوپس "Rohdopis" تھا) کی محبت میں خراب و خوار ہوا تو سیفو نے ایک نظم میں اُسے سخت تنبیہ کی۔

اُس کے ہمعصر اور مستند شاعر الکائیس نے سیفو کو ان لفظوں میں مخاطب کیا ہے:۔

"بنفشے کے پھول بُننے والی، مسکراہٹ سے مٹھاس برسانے والی، پاکیزہ سیفو! میں تجھے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر حجاب کرتا ہوں!"

سیفو نے اس نظم کا جواب نظم سے دیا:۔

"تیری خواہش اگر کوئی عمدہ بات کہنے کی ہوتی تو تیری آنکھوں کو شرم نہ چھو سکتی اور تو جو کچھ کہنا چاہتا تھا برملا کہہ سکتا!"

سیفو کی محبت کے اِن افسانوں پر سب سے پہلے ایک جرمن نقاد ویلیکر (Welcker) نے درایت کی نظر ڈالی اور اپنے استدلال سے سیفو کو تمام انسانی اور نسوانی خوبیوں کا مجسمہ قرار دیا۔ مسٹر میور (Mure) نے اس سے اختلاف کیا اور بحث کی گرماگرمی اتنی بڑھی کہ دونوں حد سے تجاوز کر گئے۔

اُس وقت کے ادنیٰ طربیہ نگار شعراء سیفو کو ایک آوارہ، عشرت پرست اور لیسباس کے اوباش حلقے میں اپنی شاعری اور نیت اخلاقی کے سبب مقبول ہونے کے رنگ میں پیش کر کے ان بحثوں کے لئے موضوع پیدا کر گئے اور ان بحثوں کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ سیفو مسلم طور پر اگر اپنے زمانے کے معیار اخلاق سے بالاتر نہ تھی تو گری ہوئی بھی نہ تھی۔

اس گفتگو کے آخر میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کا یہ قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "اگر مثلاً اُس خاکے کو سامنے رکھا جائے جو ارسٹوفینز نے سقراط کا بنا کر پیش کیا تھا تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ سیفو کے متعلق اس ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس تمام کو یکسر ہفوات سمجھیں"۔

مذکورہ بالا شہادتوں سے سیفو کے کردار کو اُس گندگی سے پاک کیا گیا ہے جو یونانی طربیہ نگاروں نے اُسکے

سر تخیلی تھی اور جس کی تفصیلات اور دلائل اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اور اس واقعے سے بھی انکار کیا گیا ہے کہ اُس قصے کی اگر کوئی اصلیت ہوتی تو اُسوقت کے یونانی ادب میں اُس کا ذکر آتا۔ یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ چونکہ بعض قدیم بیانات میں ایڈونس کو فاؤن کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس لئے یہ فسانہ وینس واڈونس کے قصے کی یاد تازہ کرنے کے لئے وجود میں آیا۔

لیکن اس تمام تحقیق و تلاش میں جو انسانی فکر و جستجو کا تحیر خیز کارنامہ ہے، ایک بات یکسر نظر انداز کر دی گئی ہے اور وہ سیفو کا انسان اور عورت ہونا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ سیفو اُس قوم کے افراد میں تھی جو حسن کے مظاہر کی دیوانی تھی، لیکن یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا کہ سیفو کو کسی سے محبت ہوئی۔ وہ محبت جو دو گوشت پوست کے انسانوں میں ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا جا سکا کہ سیفو کو اپنے شوہر سے محبت تھی۔ فاؤن کے افسانوں کو قیاسات سے غلط ثابت کیا گیا ہے کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر دوسرے پہلو سے بھی قیاسات کی شہادت مانی جائے تو خود ایک انگریز نقاد کو تسلیم ہے کہ یہ افسانہ، سیفو کی شاعرانہ شخصیت پر چست لباس کی طرح زیب دیتا ہے۔

ایک ایسی شاعرہ جس کا ثانی پچیس صدی کا ارتقا بھی پیدا نہ کر سکے، محبت کئے بغیر اتنی زبردست مغنیہ محبت بن جائے! قیاس قبول نہیں کرتا۔ شاعر اگر حقیقی ہے تو اُس کے لئے محبت ناگزیر ہے! پھر سیفو کی تو فطرت شعر کے سانچے میں ڈھلی تھی! اور اُس کے ساتھ نفس انسانی کی رمز شناسی، جذبات کی سچی قدر دانی، راحت و آرام کی زندگی، یہ سب لوازم مہیا ہوں اور محبت کو دخل نہ ملے! عقل نہیں مانتی ایسی سیفو کا کسی کی محبت میں دیوانہ ہو جانا، اُس کا محبت سے محروم رہنا، بے شک حیرت انگیز ہو سکتا ہے! اس کے برخلاف محبت کرنا اور نراس ہونا جو سچی محبت کا انعام ہے اور پھر اُس محبت پر قربان ہو جانا، سیفو کی ہستی کو ایک شعر نغز بنا دیتا ہے — محبت کا ایک شاہکار پیش کر دیتا ہے۔

سیفو کی ذات سے اس واقعے کی نسبت نے اُس کی شخصیت میں ایک طلسمی کشش پیدا کر دی ہے۔ جن محققین نے اس فسانے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کاوشیں کیں، کوئی شک نہیں کہ تحقیق کی دنیا میں قابل صد تحسین کام کیا ہے، لیکن شعر و شباب کی دنیا میں تو اسے شکست طلسم سے تعبیر کیا جائے گا اور اس سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ اس سراسر تخیلی قصے نے بیش بہا ادب پارے پیدا کرا دئے اور اعلیٰ قسم کی نظم و نثر وجود میں آ گئی۔

حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن سیفو کا یہ "نامۂ محبت" اس قابل ہے کہ باقی رہے۔

سیفو کا محبت نامہ

پیچھے بتاؤ، جب تم نے یہ خط پڑھا تو کیا میری صورت بھی تمھارے ذہن میں آ گئی تھی؟ اور کیا آخر میں نام پڑھنے سے پہلے تم جان گئے تھے کہ خط کس کا ہے؟

تم کہو گے کہ میرا محبوب مشغلہ تو گیت بنانا ہے، میں نے یہ نوحہ کیوں لکھا؟ ہاں، مگر میری محبت مغموم ہے۔

یہ نوحہ ایک مغموم نغمہ ہی تو ہے! حالانکہ میرے بربط سے آنسوؤں کا گیت نہیں نکلتا! مگر میں اس طرح پھُنک رہی ہوں جیسے مکئی کا بھرا پُرا اور تیار کھیت تیز پُروا میں لَو دیتا دکھائی دے!

فاؤن، ایٹنا کے کشت زاروں میں پھر رہا ہے اور میرے دل میں ایٹنا کی آگ روشن ہے!

میرے بربط کے تار ملے ہوئے ہیں لیکن مجھے کسی گیت کا الہام نہیں ہو رہا ہے، وہ دماغ جو گیتوں میں بات کرتا ہو خیالات سے خالی ہے!

لیسباس کی دوشیزہ لڑکیاں، ماپڑھا کی کنواریاں، اور میتھمنا کا کنارا اب مجھے نہیں لبھاتے۔ انکٹوریا اور سائڈرو کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے اور نہ ایتھیس میں کوئی دلکشی، اور میری وہ محبت جس میں سیکڑوں شریک تھے اور جو میری رسوائی بھی بن گئی اب صرف تمہارا حصہ ہے —— تنہا تمہارا! تم کتنے خود غرض ہو!

تم خوبصورت ہو ایسے کہ جوانی تم سے چہلیں کر رہی ہے، اور اے حسنِ پُرلذت! تمہاری خوبصورتی اور جوانی میری نظروں کا جال بن گئی ہے! تم اگر گز اور بیلا اُٹھا لو تو فیبس[1] (Phoebus) بن جاؤ گے، اور جو ماتھے پر ایک سینگ لگا لو تو باخس[2] (Bacchus) نظر آؤ گے! فیبس نے دوشیزہ کریٹ کی آرزو کی اور باخس نے ڈیفنی کی۔ لیکن گیت گاتا نہ تو کریٹ والی جانتی تھی اور نہ ڈیفنی! ایسے شیریں نغمے، یہ مدھر گیت تو میوزوں نے بس سیفو کو سکھائے ہیں جن سے دُنیا گونج رہی ہے! الکائیس بہتر سُر لگا لیتا ہے لیکن اُس کی شہرت برتر نہیں، اگرچہ میرا اور اُس کا وطن ایک ہے، ساز ایک ہے!

بے مہر فطرت نے مجھے زیبائی نہیں بخشی، لیکن اُس کے بدلے میں روشن و رسا ذہن دیدیا ہے! میرا جسم و قد مختصر ہے، لیکن میرا نام زمینوں اور سمندروں سے بڑا ہے۔ یہی میری قدر و قیمت کا پیمانہ ہے! میرا روپ رنگ سانولا ہے، پر کالی رنگت والی اینڈرومیڈا[3] (Andromeda) پرسیوس[4] (Perseus) کی نگاہوں میں گوری تھی! رنگ دار کبوتروں میں سفید کبوتریاں اکثر دیکھی جاتی ہیں اور سیاہ کچھوے کی مادہ سبزہ رنگ ہوتی ہے! لیکن تمہیں اگر اپنا ہی سا جوڑا چاہیئے تو یاد رکھو کبھی نہ پاؤ گے — ایسی کوئی نہ ملے گی! ہاں، اگر تم مجھے پڑھو گے تو میرا حسن و جمال بڑھ جائے گا! اور تم کہتے بھی تو تھے کہ تو بس باتیں کرتی رہ!

مجھے یاد ہے کہ جب میں گاتی —— کہ محبت کرنے والے ہی گانا جانتے ہیں —— گاتی ہوتی، تو تم میرا منہ چوم لیتے تم میرے گانے کی تعریف کرتے، میری ہر چیز اور ہر بات سے خوش ہوتے — خاص کر جب محبت تسکین پاتی! میرا چنچل پن تمہیں بہت بھاتا، میری چلبلاہٹ تمہاری نظر میں بہت پیاری ہوتی! اوہ! جب ہماری محبت اپنا حق

---

[1] اپالو سورج کا دیوتا۔ [2] شراب کا دیوتا۔ [3] ایک حسین دوشیزہ جو ستارہ بنا دی گئی — [4] ایک یونانی ہیرو جس نے اینڈرومیڈا کو رہائی دلائی

پالیتی تو خواب ناک کاہلی میں خستہ و خموش پڑے رہنا! کس قدر مزہ دار گھڑیاں ہوتی تھیں!

مگر یہ نئی فتوحات ـــ سسلی کی لڑکیاں ہو اور تم! اب لیسباس کہاں؟ مگر میں بھی سسلی ہی کی ہوں! اے میگریا کی ماؤ اور لڑکیو! اس فراری کو پلٹا دو! اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا۔ میں بھی انھیں لفظوں کو سن چکی ہوں! آنزیکیس (Amyx) والی دیوی! میں تو تیری زبان ہوں ـــ میری مدد فرما! میرے باپ کی موت پر جب اُس کی مٹی میرے آنسوؤں سے بھیگی تو میں نے چھے ہی بہاریں تو دیکھی تھیں! میرے بھائی نے ایک بیسوا کے پیچھے اپنی دولت اور عزت کھو دی اور اب اُسے بری طرح پھر حاصل بھی کرنا چاہتا ہے جس طرح کھوئی تھی، اُس نے اپنی بہن سے کھری کھری سنیں۔ یہ تو میرے ضمیر اور صاف گوئی کا تقاضا تھا۔ اور یہ مصیبتیں نہ ہوتیں تب بھی میری بچی کی فکریں کیا کم تھیں

لیکن اب سب سے بڑھ کر میرے غموں کا باعث تم ہو! میری ناؤ ہلکی اور مخالف ہوائیں تیز ہیں! اب میرے گیسو پریشان رہتے ہیں اور اُنگلیاں نگینوں سے خالی! میرا لباس گھٹیا ہے اور میرے سر پر نہ تو سنہری دمک دکھاتی دیتی ہے اور نہ اُس میں عربستان کی شبنم مہکتی ہے۔ میں اچھے لباس اور جواہر سے سجوں تو کس کے خوش کرنے کو؟ میرے جذبات کا دیوتا تو سمندر پار جا براجا ہے!

میرا دل اب اتنا گداز ہو گیا ہے کہ ایک کانٹا بھی مجھے ہلاک کر دینے کو کافی ہے۔ میرے جینے کی اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ زندگی بھر محبت کئے جاؤں!

میری پیدائش کے وقت بہنوں نے خیال رکھا تھا کہ میرے کُرتے میں موٹا ڈورا نہ ہو۔ میری صناعت نے مجھے ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ تھیلیا[1] (Thalia) کی تعلیم میرے قلب کو متاثر کرتی ہے! پھر اگر ایک چکنے گالوں والے نوجوان کی محبت کار و نظر مندی مجھے گمراہ کر دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

سحر کی دیوی! میں ڈرتی تھی کہ تو اُسے مجھ سے چھین لے گی، اور وہی ہوا!

اے آسمان کے چاند! اُس کا واسطہ جو سب کا واسطہ ہے، فاؤن کو کچی نیند میں نہ اُٹھا دینا!

وینس اُسے اپنے رتھ میں بٹھا کر الوپ کر لے گئی ہے، مگر میں ڈرتی ہوں کہ کہیں مریخ اُس کی خوبروئی کو دیکھ پائے! میٹھا برس! نہ بالکل جوان نہ بالکل لڑکا! ہاں، تیرا سن دسال تو بس ایک جوہر ہے ـــ صرف ایک مسرت! آ! او مجسم رعنائی! میری گود میں آجا! تو محبت نہ کر، میری تو اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے محبت کرنے دے!

میں اگرچہ تمھیں خط لکھ رہی ہوں مگر آنسو ہیں کہ اُمڈے آ رہے ہیں۔ کاغذ کے یہ دھبے دیکھ لو!

لیکن اگر تمھیں جانا ہی تھا تو پیار اخلاص کے ساتھ رخصت ہوتے! یہ کہتے ہوئے جاتے کہ "لیسباس والی خیر باد!"

---

[1] نو میوزوں میں سے ایک جو طربیہ کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔

میرے آنسوؤں کی اور میرے بوسوں کی تم نے قدر نہ جانی! کاش میں اُسوقت اندازہ کرسکتی کہ مجھے کیا دکھ پہونچنے والا ہے! تمھاری یاد میرے پاس تو ملامت و ندامت بن گئی ہے، مگر تمھارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو تمھیں میری یاد دلائے، حالانکہ میں تمھیں چاہتی ہوں!

میں نے تم سے کچھ نہیں چاہا — کچھ نہیں، بجز اس کے کہ میری محبت کو نہ بھلانا! میرے پیارے! محبت کی قسم — اور محبت خدا کرے تمھارے پاس رہے — نوؤں میوزوں کی قسم، جب کسی نے کہا کہ میری تمام خوشیاں اُڑ گئیں تو میری آنکھ سے نہ تو آنسو گرا اور نہ منھ سے ایک حرف نکلا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھا ہی نہیں، میرے گلے میں آواز تھی ہی نہیں! میرا سینہ برف کی چٹان تھا! لیکن جب غم کو زبان ملی تو میں نے چھاتی پیٹ لی، بال نوچ ڈالے، اور جان گھلا دینے والے صدمے سے چیخا کی! بالکل ایسے جیسے اپنے بچے کی چتا کے سامنے ایک ماں کا حال ہو!

میرا بھائی کراکس میرے غم کو دیکھ کر ہنستا ہے اور میرے صدمے کے سبب کو زیادہ شرمناک بنانے کے لئے کہتا ہے "یہ اتنا رنج کیوں کرتی ہے، اس کی بیٹی تو زندہ ہے!"

محبت اور ندامت کبھی متفق اور یکجا نہیں ہو سکتے۔ میرا مجروح سینہ لوگوں کی نگاہوں کے لئے کھلا ہوا ہے! میرے خیالات فاؤن کے قبضے میں ہیں اور میرے خوابوں کو دن کی طرح روشن وہی بناتا ہے! فاؤن، تم گو مجھ سے دور ہو مگر خوابوں میں میرے پاس رہتے ہو! مگر نیند سے جتنی خوشی مل سکتی ہے وہ بہت مختصر، نہایت قلیل ہوتی ہے! میں اکثر دیکھتی ہوں کہ میرا سر تمھارے بازو پر رکھا ہے، یا میرا سینہ تمھارا تکیہ ہے۔ بعض دفعہ یہ اختلاط اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ میرے ہونٹ — میرے سب حواس جاگ پڑتے ہیں! میں زبان در دھن تمھارے بوسہ کی لذت محسوس کرتی ہوں۔ بوسہ لینے اور بوسہ دینے، دونوں قسم کی لذت! اور پھر محبت کی رسم پوری ہوتی ہے۔ کتنی میٹھی اور پر لذت! فاؤن! تمھارے بغیر محبت کا مزا کیا!

لیکن جب دن اپنی صورت اور سب کچھ دکھانے آجاتا ہے تو میں بڑبڑاتی ہوں کہ میرے خواب اتنی جلدی ختم ہو گئے، اور میں جنگل میں نکل جاتی ہوں۔ گویا میری مایوسی و محرومی کا علاج اس سے ہو جائے گا! کیونکہ اُس جنگل نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس کا دیکھنا سب کو خوش کر دیتا ہے! میں پاگلوں کی طرح سر کھلے وہاں پہونچتی ہوں اور کھوہ کے اندر سیاہ اور کھردری چٹان لٹکتی دیکھتی ہوں جو اب سے پہلے مصفا مرمر معلوم ہوا کی تھی! میں اُس کنج میں جاتی ہوں جہاں ہم اکثر سوئے تھے اور جس کے جھونڑے ڈالیاں ہمارے اوپر جھکے رہتے تھے، مگر وہ کنج اب اوجڑ معلوم ہوا، کیونکہ جنگل کی رونق اور میرا آقا تو موجود ہی نہ تھا۔

وہ سبزہ زار جس پر ہم پڑے رہتے تھے، جس کے اوپر تمھارے قدموں کے نشان تھے، میں نے اُس جگہ کو

ہاتھ سے چھوا! آہ، وہ سبزہ جو کبھی اتنا پیارا تھا آج میرے آنسوؤں سے سینچا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی ڈالیاں آہیں بھر رہی تھیں اور چڑیوں کے چہچہے غائب تھے! بس ایک غمزدہ بلبل چیخ رہی تھی، اسلئے کہ اُس کا۔ شوہر نہیں ۔۔ محبوب مارا گیا ہے! بلبل ہائے گل پکارتی ہے اور سیفو ہائے دل!

پھر رات آکر اُس کنج کو سلا دیتی ہے۔ میں اُس بلوریں چشمے پر جاتی ہوں جو دیوتا کا استھان ہے اُس پر کنول کی ڈالیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں چشمے کے کنارے گھاس پر گر جاتی ہوں تو ایک نغمہ آکر کہتی ہے:۔

"تو اگر محبت کی آنچ نہیں سہار سکتی تو امبریسیا (Ambraeia) کے ساحل پر جا جہاں سے ڈُکمیان نے چھلانگ ماری اور پائرھا کے دل میں اُس کی محبت پیدا ہوگئی۔ ڈُکمیان کو کوئی صدمہ نہ پہونچا اور اُس کا دکھ درد مٹ گیا۔ تو بھی لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ جا اور بے خوف جست لگا۔ تیرے لئے بھی وہی ہوگا!"

یہ کہا اور وہ آواز اور آواز والی غائب ہوگئی۔ میں اُٹھی، آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو جھڑنے لگے، میں نے کہا:۔

"اچھا نغمہ، میں محبت کی دیوانی جاتی ہوں چوٹی پر، مجھے ہراس بھی نہیں ہے، جو مقدر! ہواؤ آؤ، میرے ہلکے پھلکے جسم کو اُٹھانے میں تمھیں تکلیف نہ ہوگی! محبت کے فرشتے! آ اور مجھے اپنے پروں پر اُٹھا لے کر لوکیڈیا کا کنارا میری موت سے بدنام نہ ہو!

میں اپنے بربط کو جو میرے اور فیبس کے لئے مشترک فخر کا باعث تھا، فیبس پر چڑھاتی ہوں۔ میرے بربط پہ یہ شعر لکھوا دینا:۔

"یہ بربط سیفو کا نذرانہ ہے! وہ جتنا سیفو کے لئے موزوں تھا اُتنا ہی موزوں تیرے لئے ہے!"

آہ، مگر او بھاگ جانے والے تو مجھے لیکٹیم کے کنارے جانے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ تو ہی کیوں نہیں آ جاتا کہ لوکیڈیا کی موجوں سے بہتر علاج تو تو ہے! تو فیبس دیوتا کی طرح گبرو اور جوانمرد ہے! اُف، تو بحری چٹانوں سے زیادہ سنگدل ہے ۔۔ تو میری موت سے ایک شاندار خطاب حاصل کرنا چاہتا ہے!

ہمارے دونوں کے سینے متصل ہونے کی جگہ، میں لوکیڈیا کی چوٹی پر سے کود رہی ہوں! فاؤن، یہ وہی تو سینہ ہے جسے تم نے فطنت کی آگ سے معمور، کیا تھا!

اے کاش میں گا سکتی! لیکن غم کی آگ نے میرے دل کو جلا ڈالا، اور میری فطنت و صناعت کو تباہ کر دیا ہے۔ اب میرے گیتوں میں وہ ہنروری نہیں رہی، اب میرا بربط چپ ہے۔ اُس کے تار خموش ہیں۔

لیسباس کی بیاہتا اور کنواریو! ایولیا کے گیتوں میں تمھارے نام بڑے پیارے لگتے ہیں، لیکن لیسباس کی محبت میرے لئے تو رسوائی لائی! اب تم میرے گیت سننے اکٹھی نہ ہونا! وہ سب کچھ جسے تم سماوی سمجھتی تھیں۔

فاؤن کے ساتھ اُڑ گیا! میں — میرے فاؤن — کہنے والی ہی تھی! بدنصیب سیفو! جاؤ، اور اُسے بلا لاؤ تو پھر میں تمھیں گیت سناؤں گی! میری فطنت کو چمکانے اور ماند کرنے والا تو فاؤن ہے!

اُف، مگر میری التجائیں کس کام کی! اُس کا دل کب پسیجتا ہے! میری التجائیں تو تیز ہواؤں کے ساتھ بہ جاتی ہیں! او گھونگے! تو ہی میری التجاؤں کو لے جاتا اور اُسے واپس بلا لاتا!

ہاں، چڑھاوے کے پھل پھول تو لد چکے ہیں، تو روانہ کیوں نہیں ہوتا، اور میرے دل کو کیوں عذاب دئے جا رہا ہے؟ اُٹھ، وینس دیوی محبت کرنے والوں کے لئے سمندروں کو ساکن کر دیتی اور بادِ مراد چلا دیتی ہے! روانہ ہو جا، کیوپڈ تیری کشتی کا کھویا ہے، وہ اپنے نازک ہاتھوں سے پالین چڑھائے گا!

لیکن اگر تجھے سیفو سے گریز ہی ہے، تو اُس سے بے وجہ بھاگتا ہے، تو نفرت سے لکھی ہوئی ایک سطر بھیج دے تاکہ میں لوکیڈیا کی چوٹی پر چڑھ کر قسمت آزماؤں!"

جیسا کہ اوپر کہیں بتایا گیا ہے یہ "محبت نامہ" اووڈ کا کہا جاتا ہے مگر مستند نہیں ہے۔ بہرصورت ایک ادب پارہ ہے۔ اُسے سیفو نے لکھا یا نہیں، وہ ایک پارۂ ادب ہے۔ اور اُس کو وجود میں لانے والی اگر سیفو نہیں تب بھی وہ اُسکے وجود میں آجانے کا سبب تو ہے!

سیفو کی صناعت شعری

اپنے زمانہ میں سیفو کو جذبات انسانی کے گیت گانے والی واحد مغنیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن سیفو کی شاعری کو ایسا فوق بنا دینے والے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لئے سب سے پہلے اُس کے ہمعصر شعرا اور نقادوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چھ سو سال قبل مسیح جب سیفو نے دنیا سے اپنی عظمت و عزت کا خراج وصول کیا، اُسوقت یونانی ثقافت (کلچر) کے مرکزوں میں نغماتی شاعری عجیب اور مخصوص طریق پر مقبول تھی۔ خاص کر (Aeolian) جزیرے کے لوگوں میں یہ صنف شعر عروج کمال کے آخری نقطے پر پہونچ گئی اور یونان کے ذہین مطالعے کا موضوع اور ذکی دماغوں کا محبوب ترین مشغلہ تھی۔

اِن نغمات کی مملکت، ان گیتوں کی راجدھانی مٹی لین تھا، جہاں مقدس قربان گاہوں پر، مرکے معطر کنجوں میں چشموں کی منور روانیوں پر، لاجوردی سمندر کے کناروں پر، اور رنگ و بو کے باغوں میں، حسن اور عشق کی جوان آنچ کو الفاظ میں بند کیا جاتا تھا۔ اور زمزمہ و شعر کی اِس دنیا، فصاحت و ترنم کے اِس عالم پر گیتوں کی رانی سیفو کی حکمرانی سب نے مان لی تھی۔ اُس کے حضور ان گانے والوں کا ایک مختصر دربار لگتا تھا، اُس کے ہمعصر نغمہ سرا، حتیٰ کہ الکائیس بھی سیفو ہی کا گیت گاتے تھے!

سیفو کا کمال شعر اِس حقیقت میں چھپا ہے کہ سیفو کے عہد سے لیکر فنِ انتقاد کی خردہ گیری جتنی زیادہ شدید

ہوتی گئی۔ دوسری ناقابل انکار حقیقت سیفو کی صناعت کے باب میں یہ ہے کہ اُس کا سرمایۂ شعر ایک ہزار سال تک ہر قوم کی بول چال کا جزو رہا، روزمرہ کے حوالوں میں آتا رہا، استناد کے طور پر مستعمل رہا۔ خیالات بدلتے رہے، نقطۂ نظر میں فرق آتا رہا، لیکن سیفو کے اشعار میں فرسودگی پیدا نہ ہوئی، اُن کی ندرت قایم رہی، وہ اُسی طرح تازہ و شگفتہ رہے! فن شعر میں جتنی نزاکتیں پیدا کی گئیں وہ گویا سیفو کے کلام سے ہی لے کر پیش کی گئیں، کیونکہ وہ ہر زمانے کے نقد پر پورا اُترتا رہا۔ شاعر اپنا تفوق سیفو کے اتباع سے ثابت اور نقاد اپنا فن اُس کی سند سے قایم کرتے رہے۔

اسے موجودہ و آیندہ زمانوں کی خوش بختی سمجھنا چاہیئے کہ سیفو کے کلام کے چند نمونے فنا کی دستبرد سے بچ رہے ورنہ اگر یہ بھی ضایع ہو جاتے تو اِس عہد کا نقاد، یونان قدیم کے نقادوں کے اُن تبصروں کو سمجھ بھی نہ سکتا جو سیفو کے اشعار پر لکھے گئے۔ والٹس ڈنٹن (Walter Denton) عہد جدید کے ایک انگریز نقاد نے شعر پر ایک مقالہ لکھا ہے، اُس کی وہ چند سطریں جو سیفو سے متعلق ہیں اِس جگہ نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا:۔

"سیفو سے پہلے ایسے نغمے نہیں گائے گئے تھے، اور اُسکے بعد بھی انسانی روح نے جذبات کی آگ میں تپ کر ایسی آہ و کراہ کبھی نہیں کی۔ فنی اعتبار سے بھی صفائی، سلاست اور اُس شاہانہ ایجاز کلام میں جو کسی صناع کو ملہم غیب بھی شاذ ہی سکھا تا ہے، دنیا نے سیفو کا ثانی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کوئی ایسا بھی نظر نہیں آتا جو سیفو کے مقابلہ میں دوسرا درجہ پانے کا بھی مستحق ٹھہرے!"

اس زمانے کے ایک دوسرے نقاد جے، اے، سائمنڈز (J. A. Symonds) نے لیسباس والوں کی اس خصوصیت کا قصیدہ پڑھا ہے کہ وہ جسمانی حسن اور مناظر قدرت کے پرستار تھے اور پھر سیفو کے کلام کی خصوصیتوں کو اُجاگر کیا ہو اُس نے سیفو کی بعض تشبیہات بھی پیش کی ہیں، مثلاً:۔

چاند کو "آلہتہ الجمال وینس کی پجارن[1]" کہا ہے۔

دوسری جگہ چاند کو "آسمانوں کی دلفریب حکمراں" کہا ہے۔

ایک اور مقام پر چاند کو "گلابی اُنگلیوں والی" اور قربانگاہ پر رقص پرستش کو منور بنانے والی" کہا ہے۔

نور سحر کو "سنہری چپلوں والی" کہا ہے۔

نخلستان کو "سیب کی شاخوں میں بہنے والے چشمے کے راگ نائم و غنودہ" بتایا ہے۔

لونگ میں "شہد کی مہک" سونگھی ہے۔

"پھولتی جوانیوں سے بار گندھوائے" ہیں۔

---

[1] یونانی زبان میں چاند کے لئے جو لفظ مستعمل ہے وہ گرامر (صرف۔ نحو) کے لحاظ سے مونث ہے۔ (ادارہ)

رات کو "بہت سے کانوں والی" کہا ہے
زمین کو "بے گنتی پھول مالاؤں سے سجی ہوئی" کہا ہے۔
قمری کے مجسمے کے پروں کو "موت کی خنکی سے نڈھال" دکھایا ہے۔
مجیرے کی آواز کو "گرمی موسم کو مسحور کرنے کا منتر" کہا ہے۔
جوسمار میں ماری پھرتی چڑیا کے حسن کو سراہا ہے۔
بلبل کو "سروش بہار" کہا ہے۔
سیب کی رنگت کو "میٹھا انفعال کہکر اُسے گل داؤدی سے متقابل کیا ہے
اپنی شاعری کے تار و پود کو "نیمفون (Nymphon) کے باغ کی آرائش" کہا ہے۔
ایک نوعروس اور اُس کی دوشیزگی کا مکالمہ لکھا ہے۔

یونان قدیم کے اکثر نقادوں نے سیفو پر تبصرے لکھے لیکن بجز تعریف و توصیف اور کچھ نہ لکھ سکے۔ ان قدیم تبصرہ نگاروں کی توصیف اس لئے زیادہ وزن دار ہے کہ وہ اپنے ادب کی روایات اور اپنی زبان کی نزاکتوں سے زیادہ واقف تھے۔

سیفو کی شاعری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، جن کی فنی خوبی اور طرز بیان کا حسن پہچاننا تو ہمارے لئے ممکن نہیں، تاہم خیالات و جذبات سے پورے طور پر ہم شرابور ہو سکتے ہیں!

وینس[1] دیوی کی شان میں:-

مرصّع تخت پر بیٹھنے والی لازوال سائپریس! خداوند جیوپیٹر کی بیٹی! تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ میری روح کو بھی غموں سے نجات دے! کہتے ہیں پچھلے زمانے میں تو اپنے باپ کے سماوی محل سے نکل آتی تھی! یہ اگر سچ ہے تو سماوی ملکہ! میری التجاؤں پر بھی رحم فرما! اور اپنے سنہری رتھ کو ایک بار پھر کہکشاں کی سڑک پر دوڑا دے! تیری محبوب قمریوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے تاریک دنیا کی ہوائیں پھر ایک دفعہ پاکیزہ بن جائیں!

مقدس دیوی! میں ایک آواز سن رہی ہوں! کیا یہ تیرے غیر فانی لبوں کی صدا ہے؟ کیا تیرا جلوہ و جمال کی کرنیں پھیلا دینے والا چہرہ مجھ سے میرے غم کا حال پوچھ رہا ہے؟

دیوی! میری محبت کی دیوانی روح تجھ سے اور کچھ طلب نہیں کرتی، بس یہ سننا چاہتی ہے کہ جو دوشیزہ سیفو

---

[1] ڈایانیسیاس نے اسی نظم پر تبصرہ کیا ہے۔

کے رنج والم کا باعث ہے وہ سیفو کے پہلو سے آ لگے گی! اگر تحفے لینے سے نفرت ہے تو تحفے دینے پر ناز کریگی وہ اگر شرمیلی اور بوسے سے گریز کرتی ہے تو خود بوسے دینے لگے گی!

ملکہ، ایک دفعہ اور آجا، اور اپنی اس پجارن کو غم کے پنجے سے چھڑا دے! اور میری کشت آرزو کو سرسبز بنا دے! آ، اور مجھ پر ہمیشہ مہربانی فرما — میری دوست بن جا!

مجبوب لڑکی کے نام[۱] :۔

وہ جسے تو اپنا مہمان بنالے، جو تیرے روبرو ہو، قریب بیٹھکر تیری میٹھی میٹھی باتیں سننے میں محو ہو سکے، تیری ہنسی کے نشے سے مست ہو سکے، دیوتاؤں کا ہمسر ہے!

مگر یہی منظر میرے پہلو میں میرے دل کو لرزا دیتا ہے! میں تیری صورت پر نظر ڈالتی ہوں تو گونگی ہو جاتی ہوں، منہ سے بات نہیں نکلتی! اُس گھڑی ایک شعلہ بھڑک کر میری ہستی پر چھا جاتا ہے۔ میری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، میرے کان سن نہیں سکتے، میرے اعضا میں بار بار ایک تھرتھری دوڑ جاتی ہے، میرے ماتھے پر پسینے کی شبنم افشاں ہو جاتی ہے، میرا رنگ اُڑ جاتا اور میں سفید پڑ جاتی ہوں، میں دیوانی ہو جاتی ہوں، نزع کی طرح میرا دم گھٹنے لگتا ہے!

ایک مجسمہ شباب و رعنائی جوان کو دیکھ کر کہتی ہے :۔

"حسین دوست! سامنے آ، میری طرف دیکھ، اور اپنی آنکھوں میں مستور رعنائی کو عریاں کر دے!"

ایک پارے میں اپنے اظہار احساس کے ساتھ انسانی فطرت پر طنز بھی کر جاتی ہے :۔

"وہ مجھے زیادہ دکھ پہونچاتے ہیں جن کے ساتھ میں اچھا برتاؤ کرتی ہوں!"

اپنی میوز (سروش غیبی) کو مخاطب کرنے میں لطیف تعلّی بھی ہے :۔

"میری بنفشہ کی بننے والی میوز! میں تجھسے اپنا جایز حصہ مانگتی ہوں!"

حسن صورت اور حسن سیرت کی تصریح کرتی ہے :۔

"جو حسین ہے، وہ دیکھنے ہی کا حسین ہے، جو نیک ہے وہ حسین پہلے ہے!"

اپنے شاعرانہ احساس کو اس طرح بیان کرتی ہے :۔

"ساحل پر بکھرے ہوئے بلور کے ٹکڑوں کو چھیڑ و مت، یوں ہی پڑا رہنے دو!"

حقیقت کی عقدہ کشائی کرتی ہے :۔

"مجھے وہ شہد نہیں چاہئے جس کے اندر مہال ہے!"

---

[۱] اسی نظم پر لاطینی نقاد لانگنس نے بحث کی ہے۔

جذبات کا نغمہ اِس طرح سناتی ہے:-

"چاند اور ثریا اپنی اپنی جگہ قایم ہو چکے ہیں،
آدھی رات آ چکی ہے، وقت جا رہا ہے،
چلا جا رہا ہے، اور میں اکیلی پڑی ہوں!"

ایک شاعرانہ احساس سناتی ہے:-

"نیچے، سیب کی ڈالیوں کو چومتا، پانی بہہ رہا ہے،
اوپر کی پتیاں سرسرا کر گہری نیند بہا رہی ہیں!"

ایک دوسرا:- "قربان گاہ کے گرد کنواریاں کھڑی ہوگئیں،
اُن پر، چودھویں کی چاندنی چھٹک رہی تھی!"

فطرت محبت اور جذبات کے طوفان کو ایک لفظ میں بند کر لیتی ہے:-

"حسین دوشیزہ جب محبت کرتی ہے،
تو بہت سے ہار گوندھ ڈالتی ہے!"

شباب اور عشق کی تصویر کھینچتی ہے:-

"آ، وینس آ، اور
ان اپنے اور میرے دوستوں کے لئے، طلائی کوزوں کو
محبت کی شراب اور لذتوں سے بھر دے!"

ایک "شادیانے" میں جذبات کو اس طرح گاتی ہے:-

"نئی دلہن، جس کے سینے میں گلابی محبت کا گھر ہے،
اے پافوس کی طرح سندر دلہن!
سہاگ پلنگ طیار ہے،
جا، اُس سے مل اور،
اختلاط کی مٹھاس میں شریک ہو جا،
روشن زہرہ کی کرنیں ہیرا دیوی کی روپہلی چوکی
کو حیران تمناؤں...... دیکھتے ہوئے،
تیرے دل میں اُسے (شوہر کو) مسند نشین کر دیں گی!"

شام کے منظر کی کیفیات کو کس نزاکت تخئیل سے پیش کرتی ہے :-

"صبح کی چمک نے جن چیزوں کو دور بھگا دیا تھا،
زہرہ (شام کا ستارہ) تو اُن کو گھر بلا رہی ہے،
تو بھیڑوں اور بچوں کو اس طرح بلا رہی ہے،
جیسے بچوں کو ماں سینے سے لپٹانے کو بلاتی ہے!"

اپنی حسرت کو کتنا حسین بنا دیتی ہے :-

"کیا میں ابھی کنوارپن کی آرزو رکھتی ہوں!"

آرزوؤں کی نارسائی کا حسین ترین استعارہ ہے :-

"اے دوشیزہ! تو اُس شیریں اور سرخ سیب کی مانند ہے
جو سب سے اونچی ڈالی میں،
باغباں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے —
نہیں، چھپا ہوا نہیں بلکہ اُسے ترسا رہا ہے!"

نو عروس اور اُس کی دوشیزگی میں مکالمہ کراتی ہے :-

نو عروس :- تو کہاں گئی، کہاں چلی گئی، میری دوشیزگی؟

دوشیزگی :- نوجوان لڑکی، اب میں تیری نہیں ہو سکتی، میرا جانا تو ایک صبح کی خوش آمد ہے!"

کیفیات شباب کی تصویر یوں بناتی ہے :-

"اور اُن کے بھاری پپوٹوں پر،
رات کی تاریک نیند پڑی لوٹ رہی ہے!"

ایک گل اندام کی تعریف کرتی ہے :-

"دودھ سے زیادہ سفید،
ریشم سے زیادہ نرم،
گلاب سے زیادہ نازک،
رباب سے زیادہ مترنم،
نرگس سے زیادہ لوچدار،
اور سونے سے بہتر سونا!"

ل - احمد (اکبر آبادی)

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

جولائی سنہ ۴۶ء کے نگار میں نیاز صاحب نے مندرجۂ بالا عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، تقریباً وہ صحیح ہے اور مسلمانوں میں ہر نکتہ سنج و دقیقہ رس کے روبرو قرآن کا یہی آئڈیا ہے۔ لیکن مسلم عوام کے خوف کی وجہ سے کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا اظہار کرکے توہم پرستی کو دور کرنے میں مدد دے۔ اگر نیاز صاحب کی یہ صاف بیانی اپنی ذاتی تشہیر سے پاک ہے اور صرف مسلم قوم کی اصلاح کے لئے ہے تو سب سے پہلے میں اس جرأت کی داد دیتا ہوں۔ اگرچہ اس موقع پر داد دینا بھی مقدس گروہ کے نزدیک کفر میں داخل ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک قوم میں ایسے جری اور صاف گو نہ ہوں گے، مسلمان کبھی شاہراہِ اسلام پر نہیں آسکتے، بلکہ ہمیشہ کفر و اسلام کی بحث اور رسم پرستی میں پڑے رہیں گے۔

آج سے چند صدی پیشتر یورپ کی توہم پرستی کا بھی یہی عالم تھا جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے لیکن جب وہاں کے چند علم دوست دلیروں نے عیسائی مذہب کے باب میں صاف بیانی سے کام لیا اور خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی تو مذہبی جماعت میں ہل چل مچ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا اقتدار خطرہ میں ہے تو فلاسفہ کی جماعت اور ان کے ہمنواؤں سے چن چن کر بدلا لینا شروع کردیا اور چونکہ حکومت کی باگ ڈور نام نہاد مذہبی جماعت کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس کے نزدیک جو بداعتقاد ہوتا اُس کو سزا دیجاتی۔ اس مذہبی جماعت نے اپنے خلاف اعتقاد جماعت کو ایسی سخت و شدید سزائیں دینا شروع کیں کہ انسانوں کا خون کھولنے لگا اور بے رحمی و سنگدلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عیسائی مذہب اور پادریوں سے بددل ہونے لگے، تاہم مظالم میں کمی نہ ہوئی۔ چنانچہ پیہم شداید و مصائب اور ظلم و عدوان کے باعث رفتہ رفتہ لوگ مذہبی جماعت سے منحرف و متنفر ہونے لگے، یہاں تک کہ توہم پرستی سے آزاد ہوکر آج تمام یورپ تمام دنیا پر قابض ہے۔ اب میں اصل موضوع کو لیتا ہوں۔

ہمارے مقدس گروہ نے خدا کا آئڈیا جس طرح پر مسلمانوں کے روبرو پیش کیا اس نے خدا کے تصور میں تجسیمیت پیدا کردی جس سے عوام توہم پرست ہوگئے اور مائل بہ زوال — حالانکہ خدا نہ کوئی جسمانی کیفیت رکھتا ہے اور نہ مثل انسانوں کے جذبات سے لبریز ہے۔ خدا کا بہترین تصور قل ھو اللہ احد نے پیش کیا ہے جس میں کسی اضافہ

کی ضرورت نہیں۔

خدا کی ہستی اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لئے اول تو سورۂ اخلاص کافی ہے۔ دوسرے "کُلٌّ فی فلکٍ یسبحون" کے اعلان سے عملی قوت کو سمجھنا چاہئے۔ کائنات میں کوئی چیز، کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ ایسا نہیں جو سرگرمِ عمل نہ ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرے جن کو سائنس کی اصطلاح میں (Electron) اور (Proton) کہتے ہیں اور جو انسانی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اپنے بڑے ذروں کے گرد ہر وقت و ہر لمحہ گردش کرتے رہتے ہیں انسان کی لاش جو ایک مدت سے مدفون ہے یا نذرِ آب و آتش کردی گئی ہے، اس کے ذرے بھی بے عمل نہیں۔ ایک آہنی صندوق اور فولادی ظرف کے ذرات بھی ہر وقت عمل کرتے رہتے ہیں۔ عمل کے متعلق کرشن مہاراج کا قول ہے کہ جس قوت کا نام عمل ہے، وہی خدا ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ پوشیدہ قوت جو ہر چیز سے عمل کرا رہی ہے خدا ہے۔ جس طرح روح نظر نہیں آتی، لیکن ہے۔ اسی طرح خدا نظر نہیں آتا۔ لیکن ہے ضرور۔ پس روح یا جوہرِ روح برق یا جوہرِ برق۔ اور حیات یا جوہرِ حیات جس قوت نے پیدا کی ہے وہی خدا ہے۔ وہی حیّ و قیوّم ہے اور مذہب کی زبان میں وہی ربّ العالمین ہے، جو حسبِ استعداد سب کو روحانی و جسمانی غذا پہونچاتا رہتا ہے۔

اس کے بعد وحی، الہام اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ایک میخوار جو سیہ مستی کی حالت میں بات کرتا ہے، کیا تم اسکے کلمے سنکر نہیں کہتے کہ یہ پینے والا نہیں بول رہا ہے بلکہ کوئی اور ہے؟ حالانکہ نشہ کی حالت میں جس قدر الفاظ آواز کے ساتھ نکلتے ہیں وہ تمام شرابی کے حلق و زبان سے ادا ہوتے ہیں، لیکن تم اس پر یقین نہیں کرتے، مگر جب وہ ہوش میں بات کرتا ہے تو کہتے ہو کہ یہ بولنے والے کا کلام ہے جو اسی کے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے بالکل یہی مثال وحی کی ہے کہ بانیِ اسلام جس وقت جذب و کیف کی حالت میں بولتے تھے تو اگرچہ الفاظ آپ ہی کی زبان و حلق سے نکلے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن محرک وہ قوت ہوتی تھی جو نشۂ توحید سے لبریز ہوتی۔

بانیِ اسلام نے خدا کی ہستی کا تصور کیا، اور رفتہ رفتہ کشف و مجاہدے کے ذریعہ، انہماک و محویت کے ذریعہ جب حقیقت کو پالیا تو آپ کا شعور اس قدر کامل ہوگیا کہ کائنات کے تمام راز آپ پر روشن ہوگئے۔ تصور مجرد اور عالمِ محویت میں آپ اس درجہ سریع الحس و ذکی الفہم ہوجاتے تھے کہ اپنی ذات کا اور اپنے وجودِ پاک کا احساس تک باقی نہیں رہتا تھا، بجز اس قوتِ لازوال کے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ایسی حالت میں جو بات، جو کلام، اور جو اشارہ، یعنی جو الفاظ اور فقرے آپ کی زبان مبارک سے نکلتے تھے وہ اسی قوت و فطرت کے قانون کے مطابق ہوتے تھے جس کی تحقیق و جستجو میں آپ مستغرق ہوتے۔ اسی نوع کے کلام کو مسلمان الہام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں اور اسی کو وحی کا درجہ دیتے ہیں۔

آپ نے حضرت علیؓ کا یہ تاریخی واقعہ سنا ہوگا کہ جب دشمن کا تیر آپ کے پاؤں میں چھد گیا اور جب ہوش کی

حالت میں اس کو نکالنا چاہا تو آپ کو سخت و شدید تکلیف ہوئی ۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جب میں نماز کی نیت باندھ لوں تب اس تیر کو نکال لیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوئی۔ اگر اس تاریخی واقعہ کو غلط سمجھا جائے تو اس کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں، لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ تصور وانہماک کی قوت کوئی معمولی قوت نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

لیکن رسول میں یہ قوت بدرجۂ اتم موجود تھی، اور جس وقت آپ گردن ڈال کر غرق تصور ہوتے تھے اور آپ کا ضمیر اس قوتِ لازوال و بے نیاز کی طرف رجوع ہوتا تھا، جس کو عرفِ عام میں خدا کہتے ہیں، تو آپ کی آنکھیں ہر چیز کو زندگی سے لبریز، اور عمل سے معمور پاتی تھیں اس لئے آپ مسلمانوں کو بلکہ عام انسانوں کو عمل وانسانیت کا سبق دیا کرتے اس دلکش آواز پر لوگ کھنچتے، لبیک کہتے اور آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے۔ یہی وہ خاموش تکلم تھا جو رسول پر نازل ہوتا تھا، اور جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔

رہا جبرئیل فرشتہ کا رسول پر پیغامِ الٰہی کا لانا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ قوت جس کے ذریعہ وحی آتی تھی، اس قوت کو ہم جبرئیل کے نام سے پکارتے ہیں اور اسی قوت کا نام قرآن کی زبان میں جبرئیل ہے۔ ورنہ فرشتوں کے وجود کا یہ تخیل جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے، ایک استعارے سے زیادہ کچھ نہیں۔

امام - اکبر آبادی

نوٹ :- اگر الہام علاوہ رسول کے دوسری چیزوں پر بھی ہوتا تھا، جیسا کہ نیاز صاحب نے قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا اور نہ اس سے مسلمانوں کے عقیدے میں کمزوری آنا چاہئے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے الہام نے انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچایا، لیکن رسول کے الہام نے اتنا فیض پہونچایا کہ آدمی کو انسانیت و عمل کی دعوت دیکر ممتاز کر دیا۔ امام

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچے کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲۰ دیکر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی ۔ ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور رہے۔

منیجر نگار

نیاز کی آزاد خیالی

زندگی عبارت ہے حرکت سے اور شعر و ادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطہ پر قائم رہ سکنا محال ہے، شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اصول ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں بھی ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونا لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے ماحول کا آلۂ کار نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کر کے اپنی راہ الگ بناتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے لئے دلیل راہ بنجاتے ہیں، چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد کی سطح سے بلند ہوتے ہیں، اس لئے ان کے معاصر اور معاشران ان کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کر دئے جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آجاتا ہے جب ان کے فضل و کمال کی قدر کی جاتی ہے اور انکی پرستش ہونے لگتی ہے، یہی زمانہ آزادی کا حقیقی عہد ہوتا ہے اور ایسے ہی نفوس کے لئے ڈاکٹر جونسن لکھتا ہے:۔

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کثرت زبان کو اسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت و حالت میں کہ زبان ان کے سامنے آتی ہے اس کے برعکس ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصد و ارادہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کے دماغ میں غیر معمولی متنوع جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے احساس و خیال میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے، اس کے تصورات عمیق ہوتے ہیں، زندگی و آدابِ زندگی کے متعلق اسکی رائے تقلیدی نہیں ہوتی، تاریخ کے باب میں اس کا فیصلہ خود اسی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ و زبان میں ایک مخصوص انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کا یہ اظہار خیال چونکہ اس کے ذہنی بطون کا عکس ہوتا ہے اس لئے وہ کثیر الاشکال ہوتا ہے اور اس کے لئے جو زبان وہ اختیار کرتا ہے اس میں ندرت، لطافت و حلاوت کا بیک وقت نہایت دلچسپ امتزاج پایا جاتا ہے"

کیا جونسن کی یہ تعریف غالب دہلوی اور نظیر اکبر آبادی پر صادق نہیں آتی؟ عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں یہی دو ہستیاں تھیں جنھوں نے تمام مسلک کو ترک کر کے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے انکے زمانہ میں ان کی قدر ہونا ناممکن تھا اگر ہوتی بھی تھی تو بالکل غلط بنیاد پر لیکن ان کی عزت کا عہد بھی آگیا چنانچہ آج

ارباب کمال نے ان دونوں ہستیوں پر خصوصاً غالب پر اس قدر لکھا کہ کوئی پہلو لکھنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ یہی حالت آج جناب نیاز فتحپوری کی ہے، جناب نیاز جس بنا پر آج ننگ اسلاف تصور کئے جاتے ہیں وہ موصوف کی آزاد خیالی ہے اور یہی جوہر ان کے لئے باعث بدنامی ہے، جناب نیاز اگرچہ سماجی قوانین کے شکنجہ میں کسے ہوئے ہیں لیکن اپنے رجحانِ آزادی کے مقابلہ میں کبھی سماج سے مرعوب نہیں ہوتے اور علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جناب نیاز کا طرزِ نگارش نہ تفاخرانہ ہے نہ ذریعۂ معاش جس کا ثبوت ان کی داخلی و خارجی زندگی ہے یعنی ان کے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

نیاز کا الحاد و ارتداد

جناب نیاز کے الحاد کے متعلق اظہار خیال سے پہلے ملحدی کی حقیقت کو سُن لیجئے۔ جہاں تک نفس اختلاف و اعتراض کا تعلق ہے حکمائے اسلام میں بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں جنھوں نے جمہور علماء سے کھلم کھلا اختلاف کیا ہے۔ ابن راوندی، صالح ابن قدوس، یعقوب ابن یوسف، فارابی، ابن سینا، ابن رشد سے لیکر، امام رازی، غزالی، طوسی ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم تک سب نے خوف و ہراس کو بالائے طاق رکھکر بہت سے مسایل میں جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔

علامہ ابن قیم اور علامہ ابن تیمیہ نے فنائے نار کے مسئلہ میں جو عقاید کا بہت زبردست مسئلہ ہے علانیہ اپنی ذاتی رائے کو جمہور کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، جس کے موید جناب مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب علماء کرام کہتے ہیں تو اعتراض نہیں ہوتا اور جب نیاز وہی بات کہتے ہیں جو قدما کہہ گئے ہیں تو ہدف ملامت بنائے جاتے ہیں۔ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ "الحاد" کا لفظ بہت ہی محدود معنی میں نیاز صاحب کے مضامین پر مستعمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تقلید ترک کرکے خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں اسے پوری بیباکی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب علامہ نیاز بھی وہی لکھتے ہیں جو ہمارے بعض دوسرے علماء کرام فرماتے ہیں تو ان کے قول کو کیوں بنظر استحقار دیکھا جاتا ہے۔

مثلاً ہندوستان کی آزادی و ترقی کے لئے "نیشنلزم" پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جدوجہد مذہب کا آلہ کار ہے چنانچہ بعینہ یہی چیز ہمارے فاضل اجل علامہ عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں لیکن ہمارے علماء کرام کچھ نہیں کہتے، حالانکہ انکے نزدیک سیاست سے مذہب کی علحدگی بیدینی و ملحدی ہے۔

نیاز صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کا تعلق چند متعین رسوم و قیود سے نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ غیر مذہب کے عقلاء کے سامنے پیش کیا جاسکے اور اس طرح ہندوستان کے تمام مذاہب کسی ایک مرکز پر پہونچ کر اشتراکِ عمل پیدا کر سکیں، لیکن عبد الماجد دریابادی کے قسم کے مذہبی لوگ اسے کفر و الحاد بتاتے ہیں۔ حال ہی میں قرآن کے کلام ربانی ہونے کے متعلق جو مقالہ جناب نیاز کا جولائی کے نگار میں شایع ہوا ہے اور

جس کی بنا پر عبدالماجد صاحب نے ان کو ابوجہل کا لقب عطا کیا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، لیکن اگر اس میں واقعی کوئی غلطی ہے، تو انسانوں کی زبان میں بغیر کسی برہمی کے اس پر اظہار خیال کرنا چاہئے۔

"آتش نمرود" کے واقعہ کو بھی جناب نیاز تاریخی واقعہ نہیں بتاتے بلکہ "اساطیر الاولین" میں شمار کرتے ہیں اگر عبدالماجد صاحب یا اُن کی طرح دوسرے مجانین مذہب کے نزدیک جناب نیاز کے دلایل غلط ہیں تو ان کا جواب دینا چاہئے، نہ یہ کہ گالیوں پر اتر آئیں، دنیا کا کوئی مذہب دوسروں کو بُرا بھلا کہکر کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔

ہمارے علمار مذہب یا جمہور کی طرف سے ایسی غیر مہذب و ناشایستہ ذہنیت کا اظہار بجائے اس کے کہ لوگوں کو مذہب کی طرف سے مطمئن کرے، اور غیر مطمئن بنا دینے والا ہے، کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ علمار مذہب کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ان کا تنہا حربہ "کافر و ملحد" کہدینا ہے۔

جناب نیاز جب تک خدا کی وحدانیت اور رسالت رسول کے قایل ہیں (خواہ وہ رسالت کا مفہوم کچھ قرار دیں) دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ انھیں ملحد یا مرتد کہہ سکے۔

جس طرح عبدالماجد وغیرہ کو اپنی جگہ تفکر و تدبر کا حق حاصل ہے، نیاز کو بھی حاصل ہے اور انھیں کوئی مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ دوسرے علماء کی تقلید کریں۔ اگر علمار اپنی جگہ اسلام کی خدمت اس بات میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کو "عجوبۂ روزگار" بناکر پیش کریں تو جناب "نیاز" بھی اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کی خدمت اس کو قرار دیتے ہیں کہ وہ "قابل فہم و عمل" چیز قرار پائے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے علماء کرام الحاد و بیدینی کی اشاعت پر تو ماتم کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی مجرم حقیقتاً خود انھیں کی ذات ہے، جو اس "دورِ علم و تعقل" میں بھی مذہب کو "مزخرفات" کا مجموعہ بنائے ہوئے ہے۔ دُنیا کا کوئی ادارہ اسوقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے اور یقیناً مذہب بھی زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔

محمد عبدالشکور فکر ندوی

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت
کتابی شکل میں
نگار سایز کے ٣٣٢ صفحات پر - قیمت معہ محصول عہ/
مینجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

لوحِ محفوظ
اور
عذاب و ثواب

(جناب صفی مظہر صاحب۔ محلہ جوڑن شہید۔ غازی پور)

نگار ماہ جون سنہ ۳۳ء و جولائی سنہ ۳۳ء میری نگاہ سے گزرے۔ حسب ذیل سوالات بغرض رفع شک پیش کرتا ہوں امید ہے ان کا جواب نگار ماہ اگست میں شایع فرمائیں گے ممنون ہوں گا۔

۱۔ آپ کو تسلیم ہے کہ انبیا جھوٹے یا مکار نہیں تھے اور ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا (نگار جولائی سنہ ۳۳ء صفحہ ۵۶ سطر آخری) تو آیت "بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ" کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر کوئی حقیقت ہے مگر وہ نہیں جو مسلمان ظاہر کرتے ہیں تو آپ خود ہی اظہار حقیقت فرمائیے۔

۳۔ اگر آیت بالا میں کوئی حقیقت نہیں اور قرآن مجید کا لوحِ محفوظ سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ یوں کہئے کہ لوحِ محفوظ کوئی چیز ہی نہیں تو پھر کوئی ایسی صورت بتائیے جس سے جناب رسالتمآب کا سچا ہونا۔ ان کا ہر قول و فعل اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہونا باور کیا جاسکے۔

۴۔ اگر آیت مذکورہ مسلمانوں کی اختراع ہے تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے اور کیا آپ کوئی ایسا معیار بتا سکتے ہیں جس پر پرکھنے کے بعد ہم کہہ سکیں کہ فلاں آیت قرآن کی ہے اور فلاں نہیں۔

۵۔ آپ قرآن مجید کو لوحِ محفوظ میں درج ہونا ایک مستعار عقیدہ جانتے ہیں اور اس کی دلیل میں یہود و نصاریٰ کے اعتقادات متعلق توریت و انجیل پیش کرتے ہیں تو کیا یہ کلیہ ہو سکتا ہے کہ اگر دو روایتیں ایک دوسری سی ملتی ہیں اور انمیں سے ایک غلط ہو تو دوسری بھی غلط ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہے تو مثال مندرجہ ذیل میں آپ کیا کہیں گے۔

"دو شخص کسی کے یہاں ملازم ہیں۔ مالک انصاف پسند ہے۔ ایک ملازم چھٹی کی غرض سے بیجا عذر پیش کرتا ہے۔ مالک کے

پاس آکر درد کی شکایت کرکے زمین پر پچھاڑیں کھانے لگتا ہے۔ مالک تسکین درد کے لئے حکیم حاذق کو طلب کرتا ہے حکیم اپنی حذاقت کی بنا پر اس مریض کو واقعی مریض نہیں قرار دیتا چنانچہ مالک اس مریض کو لعنت ملامت کرکے ٹھکرا دیتا ہے کچھ دن کے بعد دوسرا ملازم بالکل اسی بیماری کا شکار ہو کر مالک کے پاس آتا ہے اور رخصت کی استدعا پیش کرتا ہے کیا مالک واقعہ سابقہ کی بنا پر اس شخص کے عذرات کو بھی لائق التفات تصور نہ کرے، اور تصدیق حال نہ کرے؟

۶۔ اگر آپ آخرت کے عذاب وثواب کو بے حقیقت تصور فرماتے ہیں تو آیت "وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا۔ ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرہ نوتہ منہا وسنجزی الشاکرین" کے معنی اس عنوان سے بیان فرمائیں کہ رسول کی صادق الکلامی بھی بحال رہے اور عقیدۂ ثواب وعذاب بھی مسترد ہو جائے؟

(**نگار**) آپ کے استفسار کا مدعا تمام حشو و زواید کو نکال کر یہ قرار پاتا ہے کہ میں "لوح محفوظ" کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آخرت کے عذاب وثواب پر (آپ کی پیش کردہ آیت کو پیش نظر رکھکر) بحث کروں۔

میں نے جون اور جولائی کے نگار میں قرآن مجید کے کلام خداوندی کے نہ ہونیکے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر جس معنی میں قرآن مجید کو خدا کا کلام سمجھا جاتا ہے وہ میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ خدا نے رسول اللہ پر اس طرح نازل کیا ہے جس طرح کوئی مادی چیز کسی کو دیجاتی ہے، میرے لئے قابل قبول نہیں اور اس سلسلہ میں میں نے وحی سے بحث کی تھی تاکہ وہ لوگ جو قرآن کو محض اس دلیل پر "منطوق ربانی" کہتے ہیں کہ اسے "وحی یوحیٰ" کہا گیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن مجید کو وحی کا نتیجہ سمجھنا اس کو مستلزم نہیں کہ اسے 'خدا کا کلام' سمجھا جائے۔

وحی والہام کا لفظ کلام مجید میں ہر جگہ فطری ذہانت واستعداد یا طبعی صلاحیت کے معنے میں مستعمل ہوا ہے اور اس لئے قرآن کا "وحی یوحیٰ" ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے اس غیر معمولی فطری استعداد یا دماغی تفوق کا نتیجہ ہے جو خدا نے ان میں ودیعت کردیا تھا اور جس کی بناء پر استعارتاً کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ کا قول گویا عین خدا کا ارشاد ہے ـــــ کلام مجید کو "کلام ربانی" کہنے کی سب سے بڑی روایتی دلیل یہی تھی اور اسی کو میں نے پیش کر دیا تھا۔ دوسری دلیلوں سے میں نے اس لئے بحث نہیں کی کہ وہ اس سے زیادہ کمزور ہیں۔ تاہم چونکہ ذکر آگیا ہے اس لئے ان کمزور دلیلوں میں سب سے قوی دلیل کی حقیقت بھی معلوم کر لیجئے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کا جواب کسی انسان سے ممکن نہیں، اس لئے وہ خدا کا کلام ہے۔ اس سلسلہ میں جو آیات پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

سورۂ بقر:۔ "ان کنتم فی ریب مما نزلنا علےٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ"

(جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے اگر اس میں تمھیں شک ہے تو اس کے مثل ایک سورۃ ہی پیش کردو)

سورۂ یونس:۔ ام یقولون افتراہ۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

(کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن رسول نے بنایا ہے؟ اگر وہ سچے ہیں تو ایسی ہی ایک سورت بنا لائیں اور خدا کے علاوہ جس کی مدد چاہیں وہ بھی حاصل کرلیں)

سورۂ ہود میں بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں لیکن یہاں بجائے ایک سورۃ کے دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے

ام یقولون افتراہ؟ قل فاتوا بعشر سورہ مثلہ

سورۂ بنی اسرائیل میں پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا مطالبہ ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تمام دُنیا کے انس و جن شریک ہوں تو بھی ایسا ہونا ممکن نہیں:۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثلہ ہذالقرآن لا یاتون بمثلہ

آپ نے دیکھا کہ ایک جگہ پورے قرآن کے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے، دوسری جگہ دس سورتوں کا اور تیسری جگہ صرف ایک سورت کا۔ اگر آپ ظاہر معنی لیں گے تو ان آیات میں معنوی تعارض پیدا ہو جائے گا اور بحث یہ آن پڑے گی کہ کیا پورے قرآن سے کم، یا دس سورتوں یا ایک سورۃ سے کم کا جواب ممکن ہے۔

ان آیات کو پڑھکر ایک یا دس یا پورے کی بحث کرنا حماقت ہے۔ مفہوم وہی ایک ہے کہ بہ حیثیت مجموعی قرآن جس چیز کا نام ہے اس کا جواب پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ لیکن اس دعوے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن کا جواب اس لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ کیونکہ قرآن میں شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو رسول اللہ سے پہلے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو۔ قرآن کے تمام الفاظ اور قرآن کا اندازِ تحریر پہلے بھی پایا جاتا تھا، لیکن قرآن کوئی نہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو "خدا کا کلام" یا "معجزہ" کہنا اس بناء پر نہ تھا کہ اس کے الفاظ میں کوئی خاص بات ہے، بلکہ اس حیثیت سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ جو راہِ عمل قرآن نے دکھائی ہے یا جو درس اخلاق و ترقی اس نے پیش کیا ہے، اس میں اُصولاً کسی اضافہ کی گنجایش نہیں۔

یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (ام یقولون افتراہ؟) لیکن اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ قرآن میں کہا ہے وہ ہوائی باتیں نہیں ہیں (ما ینطق عن الھویٰ) بلکہ وہ نتیجہ ہے وحی یا اس تائیدِ غیبی کا جو مخصوص ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

اب الفاظ "لوحِ محفوظ" کو لیجئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قرآن پہلے سے کسی تختی میں منقوش تھا

اور دوسروں کو جتنا فایدہ پہونچایا ہے اس کی دوسری مثال تو مجھے نظر ہی نہیں آتی۔

تاریخ ادب اُردو پہلا حصہ یہ کوئی جامع تاریخ نہیں ہے بلکہ طلبہ کے لئے یا اُن حضرات کے لئے جو حوالکی بڑی بڑی کتابوں سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے، یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

ابتدا میں زبان اُردو کی مختصر تاریخ درج ہے اور اس کے بعد آغاز ادب سے لیکر اسوقت تک کے مشاہیر کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

گزشتہ دس سال کے اندر ادارہ ادبیات اُردو کی یہ ساٹھویں تالیف ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت تک کتنی ادبی خدمت انجام دے چکا ہے۔ اس مرتبہ حیدرآباد پہونچکر میں نے خود اس ادارہ کو دیکھا اور اس کے اہتمام و انصرام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس ادارہ کے روح رواں ہیں اور حیدرآباد کی جدید نسل میں، جو ولولہ زبان کی خدمت کا پایا جاتا ہے اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر زور کی سعی و کوشش کا ہے۔ اس کتاب کی قیمت عہ ہے۔

محمد حسین آزاد یہ کتاب بھی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے شایع کی ہے اس میں مولانا آزاد مرحوم کے تمام حالات زندگی کو یکجا کر کے ان کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور شاعری پر بھی۔

یہ تالیف جہاں بانو بیگم (نقوی) ام۔ اے کی ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک خاتون کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ ادارہ کا شعبۂ نسواں اس سے قبل اور بھی کئی کتابیں خواتین حیدرآباد کی شایع کرچکا ہے۔

قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن۔

آبدوز اور سرنگ - پانی کی کہانی ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد نے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا شروع کیا ہے تاکہ سائنس کے ضروری مسایل عام فہم اُردو میں لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں۔ ایک میں آبدوز اور سرنگوں کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں پانی کے متعلق تمام ضروری اطلاعات یکجا کر دی گئی ہیں۔ جابجا نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے ان مسایل کو اور زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور اُردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی کوشش ہے۔

قواعد عربی حصۂ اول مولوی محمد ہبۃ اللہ صاحب نے جو گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں عربی کے لکچرر ہیں عربی زبان کے قواعد پر یہ پہلا حصہ ابتدائی تعلیم کے لئے شایع کیا ہے جو بہت سہل و مفید معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان سے مسلمانوں کی بیگانگی بہت افسوسناک بات ہے، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر اسی قسم کی کتابوں کی مدد سے بہت کم مدت میں خاص مہارت اس زبان میں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

امید ہے مولوی صاحب موصوف اس سلسلہ کو جلد مکمل کردیں گے۔

جلوۂ زارِ اظہر جناب سید دلدار حسین رضوی اظہر الہ آبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب اظہر حیدر آباد کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہیں اور وہاں کے اہل علم میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، تاریخ گوئی میں آپ کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے اور شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے۔

اس کی قیمت ۸/ ہے اور ملنے کا پتہ ۷،۶ بازار نور الامرا حیدر آباد دکن۔

تذکرۃ الہند - یادگار رضائی حکیم رضا علی خاں مرحوم کی تالیف ہے جس میں دکن اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص نہایت محنت سے یکجا کردئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شایع کی گئی ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ انجمن اطبائے یونانی حیدر آباد نے اس کتاب کو شایع کرکے واقعی فنِ طب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کاش یہ اردو میں ہوتی اور عوام بھی اس سے فایدہ اُٹھا سکتے۔

ان دونوں حصوں کا حجم ۱۰۰۰ صفحات سے زیادہ ہے اور قیمت دس روپیہ۔

پریم رس ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے بعض ادبی ٹکڑوں کا مجموعہ ہے، جو ٹگور کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مقالات بعض ادبی رسایل میں شایع ہوتے رہتے ہیں اسلئے وہ بزم ادب میں کوئی نو وارد شخص نہیں ہیں۔ ان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور زبان شستہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

مقدمۂ زندگانی محمد زندگانی محمد، محمد حسین ہیکل مصری کی مشہور تالیف ہے جس پر خود انھوں نے ایک معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب اسی مقدمہ کا ترجمہ ہے جس میں قرآن مجید اور رسالت پر جدید اُصول انتقاد کو سامنے رکھکر بحث کی گئی ہے اور ان دونوں کی اہمیت کو روایت و درایت دونوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر ہے اور قیمت ۱۰/۔

رہنمائے تاریخ اُردو فن تاریخ گوئی کی کتاب ہے جسے حاجی محمد عبدالقادر وکیل بنارس نے مرتب کیا ہے اس میں تقریباً ۵۰ شعرا کی تاریخ وفات کے قطعات درج ہیں اور اس سلسلہ میں تاریخگوئی کے تمام مروجہ طریقوں کو بھی بتا دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/ ہے۔

صبح نشاط مجموعہ ہے جناب نظیر لودھیانوی کی نظموں کا۔ جناب نظیر بہت کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی نظمیں اکثر رسایل میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے شعر و فلسفہ سے بہت متاثر ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا ہے نظریۂ اقبال ہی کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔

آپ کی نظموں میں استواری ہے اور اداسکے بیان میں زور و خودداری۔ اس مجموعہ میں ادبی، فطری، مذہبی و معاشرتی سبھی قسم کی نظمیں نظر آتی ہیں اور ان سب میں جناب نظیر کے سچے تاثرات جھلک رہے ہیں۔

طباعت وکتابت وغیرہ بہت خوب ہے اور قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نیو اسٹریٹ لودھیانہ۔

سحر حلال جناب درویش میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب درویش نوجوان شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں، تاثر کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے قبل اپنے اور میرے ایک مشترک دوست کے ذریعہ سے انھوں نے اس مجموعہ پر میری رائے حاصل کی تھی جو ابتدا میں دیدی گئی ہے۔ یہ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور جناب درویش محلہ کوٹلہ میرٹھ سے ایک روپیہ میں ملسکتی ہے۔

اُردو کا پہلا شاعر اور پہلا مدوّن پروفیسر اویس احمد ادیب نے ولی دکھنی کو اس عنوان سے پیش کیا ہے اور اس کے تمام اصناف نظم سے بحث کی ہے۔ ولی سے پہلے کے شعراء کو وہ برج بھاشا کے گننے والوں میں جگہ دیتے ہیں اس لئے اُردو کے پہلے شاعر ہونے کی خصوصیت انکے نزدیک صرف ولی کو حاصل ہے۔ کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور افادہ سے خالی نہیں۔

قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ "مصنف حلیم مسلم کالج کانپور۔

خواب بیداری آخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور کتاب "خواب شگفت" کا ترجمہ ہے جسے سید یوسف حسین صاحب زیدی نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں تمثیلی انداز سے تمام امم سابقہ وحاضرہ کے اجتماعی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں اوہام پرستی کو کتنا دخل ہوگیا ہے۔ خدا کے روبرو تمام انبیاء یکے بعد دیگرے بلائے جاتے ہیں اور اُن کے سامنے ان کی اُمتوں کی بدعتوں کا بیان کرکے محاسبہ کیا جاتا ہے، اخیر میں حضرت خاتم النبین کو بھی بلایا جاتا ہے اور تمام نزاعات مذہبی کو پیش کرکے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ ومفید ہے اور وہ لوگ جو مذاہب کے باب میں زیادہ آزاد رائے رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ترجمہ بہت صاف وسلیس کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ سید یوسف حسین زیدی۔ کوچہ میر انیس، لکھنؤ۔ قیمت ۸؍

طلسم عمل ترجمہ ہے ڈیل کارنیگی کی مشہور کتاب کا جس کے ۸ لاکھ ۲۸ ہزار نسخے ستمبر ۳۸ء تک فروخت ہوچکے تھے۔ کارنیگی نفسیات کا مشہور عالم ہے اور اس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کتاب میں بتایا ہے کہ ایک انسان کیونکہ کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے۔۔۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور ترجمہ بھی نہایت شگفتہ وسلیس کیا گیا ہے ملک کو سید مجتبیٰ حسن صاحب بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے نفسیات کے عملی اصول اُردو میں روشناس کرائے۔۔۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور عہ میں دفتر نگار سے مل سکتی ہے۔

خود دار خاتون ترجمہ ہے آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامہ کا جس میں وکٹورین عہد کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ آسکر وائلڈ کی تصانیف کا ترجمہ آسان نہیں، لیکن جناب محمد مرزا صاحب دہلوی نے بہت کامیابی سے یہ خدمت انجام دی ہے۔

قیمت ۸ / ہے اور ملنے کا پتہ دائرۂ ادبیہ۔ دریا گنج۔ دہلی۔

نشا ڈراما ہے جناب کشن پرشاد کول کا لکھا ہوا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت عورتوں کے باب میں کتنی بیرحم واقع ہوئی ہے اور ہم خدا کی اس مخلوق کے ساتھ کتنی بدسلوکی کرتے ہیں۔

اس کے مصنف بہت کہنہ مشق انشاپرداز ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خاص قسم کی متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں۔ پلاٹ اور کردا سب میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کوشش ہر جگہ کامیاب نظر آتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ لیڈر پرس الہ آباد۔

پیام کیف مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا صاحب گو پیشہ ور شاعر نہیں ہیں، لیکن اپنے فکر و احساس کے لحاظ سے پکے شاعر ہیں۔ جس کا حال لوگوں کو اسوقت معلوم ہو گیا تھا جب کلام اصغر پر ان کا تبصرہ شایع ہوا تھا۔ یہ اصغر مرحوم کی شاعری سے بہت متاثر ہیں لیکن ان کا کلام اُن خامیوں سے پاک ہے جو اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ فلسفہ و تصوف غزل کا دشمن ہے، لیکن اگر سلیقہ و تاثر کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے تو غزل میں ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو آجکل مقبول ہے۔

احسان صاحب کی شاعری میں فلسفہ و تصوف دونوں ہیں، لیکن دونوں کا صرف احتیاط سے کیا گیا ہے۔

یہ کتاب جناب مصنف سے اعظم گڈھ کے پتہ پر عہ / میں ملسکتی ہے۔

گلستانِ شرف دیوان ہے سید ابوالفتح محمد شرف الدین متخلص بہ شرف رئیس ڈھاکہ کا جس میں غزلیں، قصاید، سلام اور سہرا وغیرہ سبھی کچھ ہے، لیکن ایک رئیس کا کلام جیسا ہوا کرتا ہے ویسا ہی ہے، کوئی خاص بات کسی چیز میں نظر نہیں آتی۔ البتہ لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

مضامین محمد علی حصۂ دوم جنھیں محمد سرور صاحب استاذ جامعۂ ملیہ دہلی نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین گویا ہندوستان کی گزشتہ ۲۰ سال کی سیاسیات کی تفسیر ہے جس میں تاویلی یا روایتی کسی پہلو کو نہیں چھوڑا ہے۔ ان مقالات کی معنویت کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہو گا "مولانا محمد علی" کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور حسنِ ظاہری کی ضمانت کے لئے مکتبۂ جامعہ کی نسبت کافی ہے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

اسلام کیسے شروع ہوا | یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعہ نے شایع کی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں جناب رسالتمآب کی سیرت کو نہایت سادہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور قیمت ۸؍

جوہر عبدالحق نمبر | جامعۂ ملیہ کے طلبہ نے رسالۂ جوہر کا یہ نمبر مولوی عبدالحق کی سترویں سالگرہ کے موقع پر شایع کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے اُردو ادب کی جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا اجمالی علم تو ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن ضرورت تھی کہ ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جاتا۔ اس لئے اہل ملک کو "ارباب جوہر" کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ علاوہ ان مقالات کے جن کا تعلق مولوی عبدالحق صاحب سے ہے، دوسرے ادبی مقالات بھی اس میں اچھے اچھے لکھنے والوں کے نظر آتے ہیں۔

یہ نمبر مجلد شایع کیا گیا ہے اور قیمت ۱۲؍ ہے۔

Our countrymen abroad | انگریزی تصنیف ہے جناب دھرم یانگ دیو کی جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہندوستانیوں کی کیا حالت ہے اور وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتاب نہایت محنت و قابلیت سے لکھی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ: ۔ سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی سوراج بھون الہ آباد ہے۔

نازی ازم | جناب عبدالرحیم شبلی (بی کام) کی تالیف ہے جس میں نازی تحریک کی تاریخ ابتدا سے اسوقت تک درج کی گئی ہے۔ اس کے مولف دنیائے صحافت میں اس سے پہلے بھی اپنے معاشی مقالات کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس زمانہ میں جبکہ اس نوع کے لٹریچر کی ضرورت ہے، مولف نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب کی نہایت برمحل خدمت انجام دی ہے۔ وہ لوگ جو ہٹلر اور اس کی نازی تحریک کا مطالعہ ہر پہلو سے کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ۔ دارالادب پنجاب بارود خانہ لاہور۔

"نگار" جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

کی عدم وصولی کی اطلاع اگر آپ اب کر رہے ہیں تو اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھی بھیجئے ورنہ پرچہ دفتر سے ارسال نہ ہوگا۔

منیجر نگار۔

دُنیا میں صرف ایک مُلحد ہے اور ایک مُسلمان!

مُلحد: نیاز فتحپوری اور **مُسلمان: عبدالماجد دریابادی** ——— یہ نظریہ یا استقصار میرا نہیں ہے، بلکہ اسی شخص کی باتوں سے سمجھا ہے جسے مینے دنیا کا صرف ایک مسلمان کہا ہے۔

یقیناً حیرت کی بات ہے کہ خدا کی اتنی بڑی آبادی میں کفر و اسلام کی نیابت اس قدر محدود و مختصر ہو، لیکن عبدالماجد کی رائے یہی ہے اور کسی شخص کی ذاتی رائے کو یوں بغیر سوچے سمجھے غلط کہدینا کم از کم مجھ ایسے مُلحد کے نزدیک نہایت نامعقول بات ہے، گو عبدالماجد ایسا مسلمان اسی ضد و رقابت کو اسلام سمجھتا ہو۔

دُنیا میں بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں اور بڑے بڑے پیچیدہ فلسفے انھوں نے پیش کئے ہیں، لیکن اس زمانہ کے ایک ہندی فیلسوف، ایک ماہر علم کلام نے جس کے مسقط الراس ہونے کا فخر دریاباد کو حاصل ہے، کفر و اسلام کی دیرینہ نزاع کا نہایت ہی سادہ و مختصر فلسفہ پیش کیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے اسکے کہ عقل کچھ کم ہو۔

یہ فیلسوف کہتا ہے کہ اسلام نام ہے صرف اُس چیز کا (مینے چیز کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کا بتایا ہوا اسلام واقعی عجیب "چیز" ہے) جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور ہر وہ چیز جو سمجھ میں آجائے کیسے غیر اسلامی ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ مختصر کر کے گویا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو عبدالماجد کہے وہ اسلام ہے اور جو نیاز فتحپوری کہے وہ کفر و الحاد ہے ——کیا دُنیا میں اس سے زیادہ صاف و صریح، اس سے زیادہ آسان تشریح اسلام و کفر کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟ غالبًا نہیں - لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ضرور غور طلب رہجاتی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور میں کیا کہتا ہوں۔

سب سے پہلا فرق میرے اور اُن کے درمیان یہ ہے کہ میں ہر گفتگو میں انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہوں اور وہ وحشت و درندگی کو - وہ اگر میری زبان سے کوئی بات ایسی سن لیتے ہیں جو ان کے زعم یا عقیدہ کے خلاف ہے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مجھے مرتد و ملحد کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں اور میں جب اُن سے لایعنی باتیں سنتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے اور میں صرف انھیں احمق سمجھنے پر کفایت کرتا ہوں۔ گو اس کا فیصلہ دشوار ہو کہ دُنیا میں ملحد ہو کر جینا بہتر ہے یا احمق رہکر!

خیر، یہ تو میرے اُن کے اختلاف کے نہایت سطحی (ظاہری حدود ہیں، جن پر نہ آپ کو زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے زیادہ اصرار کی - اب آیئے ذرا معنویت کی طرف آئیں - میں اسوقت مُسلم و مُلحد کی اصطلاحات پر فقہی حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ میرے اور اُن کے درمیان جو دیرینہ تعلق "اہرمن و یزداں" کا سا چلا آرہا ہے اس کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں -

سب سے پہلی چیز جو کفر و اسلام کے درمیان مابہ النزاع یا (زیادہ صحیح الفاظ میں) مابہ الاشتراک ہے، وہ خدا کا تصور ہے - اسلام کا دعویٰ ہے اور بالکل صحیح دعویٰ ہے کہ اس نے وحدانیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مادیت کے لگاؤ سے یکسر پاک ہے، یعنی اس تصور میں کوئی بعید ترین شائبہ بھی مادیت کا نہیں پایا جاتا - یوں اگر عبدالماجد سے پوچھا جائے تو وہ بھی غالباً اس کا اعتراف کریں گے، لیکن اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ میں بھی یہی کہتا ہوں تو انھیں وحدانیت کے اس عقیدہ میں بھی کفر و الحاد کی جھلک نظر آنے لگے گی - آپ اس کو مبالغہ نہ سمجھئے بلکہ جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی رکھتا ہوں -

میں کہتا ہوں کہ خدا "نطق و کلام" کی اُس صفت سے مبرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں "خدا کا کلام" کہنا، خدا کی توہین ہے اور تصورِ وحدانیت کے یکسر منافی - وہ یہ سنکر آگ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں قرآن کا ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطہ "وحیٌ یوحیٰ" ہے - میں کہتا ہوں بیشک قرآن مجید وحی ہے، الہام ہے لیکن اس معنے میں نہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس مفہوم میں جو قرآن سے متبادر ہے اور جب میں ثابت کرتا ہوں کہ "وحی الہام" سے مراد صرف فطری ذہانت یا طبعی صلاحیت ہے تو اس کے جواب میں مجھے گالیاں دینے لگتے ہیں -

کیسی تماشہ کی بات ہے کہ "ید اللہ فوق ایدیہم" میں تو وہ ید (ہاتھ) کی تاویل کر کے اس کا مفہوم "قدرت و قوت" بتائیں (کیونکہ خدا مادیت سے مبرا ہے اور ہاتھ پاؤں کچھ نہیں رکھتا)، لیکن قرآن مجید کے باب میں وہ خدا کا حلق و زبان سبھی کچھ مان لیتے ہیں - یہاں تک کہ وحی کا مفہوم ان کے نزدیک "خدا کا کلام" قرار پاتا ہے اور "لوحِ محفوظ" کا مفہوم ایک جواہر کار تختی (واقعی تختی) جس پر یہ کلام ازل سے منقوش چلا آتا ہے اور خدا کا یہ ارشاد کہ "ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ" (انسان کا یہ منصب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے) ان کو نظر نہیں آتا -

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصود لوگوں میں اعتبار و بصیرت کی کیفیت پیدا کرنا ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے :-

فاقصص القصص لعلہم یتفکرون ـــــــ لقد کان فی قصصہم عبرۃ

لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں کلام مجید تاریخ کی کتاب بھی ہے اور تاریخی نقد و جرح کا ہدف بھی اسے بنایا جا سکتا ہے

میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے، ورنہ ان کی حیثیت ایک ایسے مصلح کی سی قرار پائے گی جو خود نہ کوئی اختیار رکھتا ہے اور نہ اتنی اہلیت کہ وہ تدبیر و مصلحت سے کام لیکر لوگوں کی رہنمائی کر سکے، لیکن عبدالماجد کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول کی حیثیت صرف ایک پیامبر ساں کی سی ہے اور قرآن مجید کی رہبری و ہدایت میں خود انکی ذاتی یا طبعی صلاحیت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو معجزہ کہنا اسی وقت اہمیت رکھ سکتا ہے جب ہم اسے رسول اللہ سے یعنی ایک انسان سے منسوب کریں، ورنہ خدا کے کلام یا خدا کی کسی بات کا معجزہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ آفتاب کو سبھی آفتاب کہتے ہیں۔ اس میں نئی بات کیا ہے۔

عبدالماجد کہتے ہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا ایک ایک لفظ "منطوق خداوندی" ہے اور اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو پہلے سے عربی زبان میں نہ پایا جاتا ہو، اس لئے بجائے قرآن مجید کے عربی زبان ہی کو معجزہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اگر معجزہ کا تعلق ہے آیات کے مفہوم سے، اُن تعلیمات سے جو ان آیات میں ظاہر کی گئی ہیں، تو میرا بھی مقصود یہی ہے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کے معجزہ یا کلام ربانی ہونے کی بحث قطعاً اُٹھ جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ "نطق یا کلام" کا مفہوم اس وقت تک متعین ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہم زبان، حلق، الفاظ وغیرہ کا تصور اس کے ساتھ شامل نہ کریں اور خدا یقیناً ان چیزوں سے پاک ہے۔ مگر عبدالماجد کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ وہی ہیں جو خدا نے جبرئیل کے ذریعہ سے رسول اللہ کے سمع مبارک میں اس طرح القا کئے جس طرح ایک اُستاد اپنے شاگرد کو ہجے کر کر کے پڑھاتا ہے، خواہ ایسا سمجھنے کے لئے خدا کو حلق و زبان کا محتاج ہی کیوں نہ ماننا پڑے۔

یہ تو صرف کلام مجید کے متعلق میرے اُن کے خیالات کا اختلاف تھا، اب اس سے ہٹ کر اور باتوں کو لیجئے:۔

میں کہتا ہوں خدا بے نیاز مطلق ہے، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا، وہ تاخر سے مستغنی ہے۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ وہ ہماری عبادتوں سے خوش ہوتا ہے اور نافرمانیوں سے برہم۔ گویا وہ دنیا کا کوئی انسانی بادشاہ ہے جسکی تعریف کیجئے تو انعام دیتا ہے اور نہ کیجئے تو دربار سے باہر نکال دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے اچھے اخلاق سے خدا کا خوش ہونا اور ہماری بداعمالیوں سے اس کا ناخوش ہونا صرف اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسان عرصہ سے دنیاوی بادشاہت کے نظام سے متاثر ہے اور اسی کی مثال کو سامنے رکھ کر اسے بہتر درس دیا جا سکتا ہے، ورنہ اس خوشنودی یا ناخوشنودی کا تعلق صرف ہمارے اعمال یا کردار کے اُن نتائج سے ہے جو اسی دنیا کے اندر فلاح یا بربادی کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دوزخ و جنت کا مفہوم یکسر روحانی مفہوم ہے اور حور و قصور، کوثر و سلسبیل جہنم و فردوس صرف تمثیلی الفاظ ہیں جن سے معنوی راحت و تکلیف کو ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن عبدالماجد کہتے ہیں کہ نہیں، حور سے مراد اسی قسم کی دنیاوی عورت ہے جس سے جنسی لطف اٹھایا جاتا ہے اور عورت و حور میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ عورت کو سیر ہو جانے کے بعد تیس روپیہ کا مہر ادا کر کے طلاق بھی دیجا سکتی ہے اور حور سے علحدگی اختیار کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، نکیرین کی گرز بازی، حشر و نشر، میزان و پل صراط وغیرہ کا وجود مادی حیثیت سے ماننا ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں تمثیلی ہیں اور خدا نے انسان کو اتنا احمق پیدا نہیں کیا کہ وہ عالم مجاز میں آکر اپنی حقیقتوں کو واشگاف کرنا ضروری سمجھے۔ خدا لاکھوں کرّے روز بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور اس کا عالم خلق اتنا وسیع ہے کہ زمین ایسا حقیر کرہ اور اس کے حقیر باشندے تو کیا اگر لاکھوں نظام شمسی روز تباہ ہوتے رہیں تو بھی اسکی کارگاہ کی رونق کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ہمارا حشر و نشر وغیرہ کا قایل ہونا اپنے آپ کو ناواجب اہمیت دیدینا ہے جس کو خدا کی عظمت کا صحیح تصور برداشت نہیں کر سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ عبادت کا اصل مقصود اخلاق میں بلندی پیدا کرنا ہے، گویا عبادت ذریعہ و وسیلہ ہے نہ کہ اصل مقصود۔ عبدالماجد کہتے ہیں کہ صوم و صلوٰۃ خود اپنی جگہ اصل مقصود ہے اور نجات کے لئے کافی۔

یہ ہیں وہ چند اصولی باتیں جن کے اختلاف پر عبدالماجد کے اسلام اور میرے الحاد کی بنیاد قایم ہے۔ میں تو انھیں غیر مسلم نہیں کہتا کیونکہ میرے نزدیک بعض عقاید کا اختلاف ایک شخص کو ملت اسلامی سے خارج نہیں کر سکتا لیکن میں ان کے نزدیک مرتد ہوں، ملحد ہوں اور اگر میرے عقاید واقعی ارتداد و الحاد ہیں (جس کا فیصلہ میں عبدالماجد سے نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے اہل علم و عقل سے چاہتا ہوں) تو میں نہایت خوشی سے اس کا اعتراف کرنے پر طیار ہوں۔

ہمارے دوست عبدالماجد ایک نہایت ہی خشک و عبوس قسم کے قنوطی انسان ہیں جن کے نزدیک زندگی نام ہے دنیا و اہل دنیا سے بیزار رہنے کا اور اپنے آپ کو سب کے لئے اجیرن بنا دینے کا، ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی گمراہی اس کی علمی و ذہنی ترقیاں ہیں اس لئے دور حاضر ان کے لئے سخت کرب و اضطراب کا باعث ہے۔

یورپ میں کسی علمی ایجاد کی خبر انھوں نے سنی اور دریا باد میں ان کو تکلیف شروع ہو گئی، امریکہ میں کسی نئی دوربین کی ایجاد کا حال معلوم ہوا اور ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اگر اتفاق سے کوئی جہاز طوفان کے صدمہ سے غرق ہو گیا تو فوراً انھوں نے اس کو خدائی انتقام سے تعبیر کیا۔

انھیں یہ جستجو تو ہر وقت رہتی ہے کہ اہل مغرب میں طلاق کا اوسط کیا ہے، شراب پینے والوں کی تعداد کتنی

ہے، موٹروں کے ٹکرانے سے کتنے آدمی روزنہ ہلاک ہوتے ہیں اور ان تمام باتوں کو وہ دورِ حاضر کی لعنت قرار دیکر اس سے پناہ مانگتے ہیں، لیکن وہ اس کو بالکل نظرانداز کرجاتے ہیں کہ علوم جدیدہ کتنی زبردست علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور فطرت کے کتنے قوائے کامنہ کو وہ بروئے کار لاچکے ہیں اسی کے ساتھ کبھی اس پر توجہ نہیں فرماتے کہ جس جماعت کو وہ "اپنی" اور "خالص اسلامی" چیز کہتے ہیں خود اس کے اعمال و اخلاق کا کیا حال ہے، اور جب تک خود اپنا دامن خشک نہ ہو دوسروں کی تردامنی پر اعتراض کرنے کا انھیں کیا حق حاصل ہے۔

جس وقت میں نے جون میں "آتشِ نمرود" پر بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ "قرآن مجید" اس معنے میں کلام ربانی نہیں ہے، جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، تو انھوں نے مجھے ابوجہل و ابولہب بھی کہا، میرے خلاف اخبارات میں مضامین بھی شایع کرائے، میرے اور نگار کے مقاطعہ کے لئے جلسے بھی برپا کئے، لیکن جو دلایل میں نے جون اور جولائی کے نگار میں پیش کئے ہیں ان کی تردید کی جرأت وہ نہ کرسکے۔ ان کے نزدیک گویا اسلام کی خدمت نام ہے صرف اس بات کا کہ جو شخص ان کے مزعومہ عقاید کے خلاف کوئی بات کہے اسے مرتد و ملحد کہدیا جائے کسی کو "مرتد و ملحد، کافر و زندیق" بنا دینا، قدامت پرست جماعت کا کوئی نیا حربہ نہیں ہے، اور ہرچند کہ اس حربہ سے انھوں نے "آزاد خیالی" کو کافی نقصان پہونچایا، لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً "عقل انسانی" کی طرف سے اظہارِ حق ہوتا ہی رہا اور برابر ہوتا رہے گا۔

ان لوگوں کا اعتراض ہے کہ مجھے یا کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اُن کے عقاید کے خلاف رائے کا اظہار کرکے انھیں تکلیف پہونچائی جائے۔ لیکن بالکل یہی اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ کسی کو آزادانہ اظہار رائے سے باز رکھ کر کیوں اُس جماعت کو تکلیف پہونچائیں، جو اسلام کی خدمت اسی میں سمجھتی ہے کہ اُسے لایعنی عقاید سے پاک کیا جائے۔

جس طرح عبدالماجد کو ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے اسلام پر اظہار خیال یا اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، اسی طرح میں بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجاز ہوں کہ اسلام کا وہ مفہوم پیش کروں جو میرے نزدیک صحیح و درست ہے۔ اگر عبدالماجد یہ سمجھتے ہیں کہ میں قرآن کو کلام ربانی نہ مان کر اسلام کی توہین اور رسول کی تکذیب کرتا ہوں، تو میں بھی اپنی جگہ یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام کہکر اسلام کی تخریب اور رسول کی تخفیف کرتے ہیں، فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے لئے دلایل بھی پیش کرتا ہوں اور وہ صرف مجھے "ملحد و مرتد" کہدینا ہی کافی دلیل سمجھتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ بازاری آدمیوں کی طرح سب و شتم پر اُتر آیا جائے۔ خود جناب رسالتمآب کا طرزِ عمل ہمیشہ یہی رہا کہ وہ مخالف کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور

غصہ کبھی نہ فرماتے تھے، لیکن عبدالماجد صاحب، کو جو اپنے آپ کو سب سے بڑا محافظ روایات نبوی کا سمجھتے ہیں، سوائے گالیاں دینے اور مغالطہ وغیرہ کی پست و ذلیل کوششیں کرنے کے اور کوئی جواب اپنے پاس نہیں رکھتے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اس نوع کی غیر انسانی حرکات سے اپنے جذبۂ انتقام کو ایک حد تک پورا کر سکیں، لیکن دنیا میں تماشائیوں کے ساتھ اہل نظر کی بھی کمی نہیں ہے اور وہ یقیناً اس کو بدنفسی پر محمول کریں گے یا اہل مذہب کی بیکسی و بے مائگی پر، اور شاید یہ دونوں باتیں عبدالماجد کو خوش نہیں آسکتیں۔

مجھ پر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا یہ الزام بھی قایم کیا جاتا ہے کہ میں نے اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کا عہد کیا تھا لیکن اس عہد سے پھر گیا۔ لیکن یہ معاہدہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب "عبدالماجد اینڈ کو" نے خود بھی اپنے عہد کو توڑ کر حکومت سے میرے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی تھی۔ آج اڈیٹر معارف کی طرف سے بھی مجھ پر یہی الزام قایم کیا جاتا ہے، حالانکہ سید سلیمان ندوی خود اس جماعت کے سرگروہ تھے جو میرے خلاف قانونی کاروائی عمل میں لائے جانے کے لئے تگ و دو میں مصروف تھی!

اگر میری معذرت شایع ہونے کے بعد وہ خاموش رہتے اور کوئی معاندانہ کارروائی نہ کرتے تو بیشک مجھ پر "انحراف عہد" کا الزام قایم ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ کس منھ سے مجھ پر الزام قایم کر سکتے ہیں۔ خود پاس عہد نہ کرنا اور دوسروں سے ایفا چاہنا عجیب تماشہ کی بات ہے!

میں نے عبدالماجد صاحب کو خط کے ذریعہ سے بھی اطلاع دیدی ہے اور اب نگار کی وساطت سے بھی میں انھیں اور تمام اُن کے ہم عقاید لوگوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں اسلام کے متعلق جو کچھ اظہارِ خیال کرتا ہوں اس کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں، لیکن اگر اُن کے نزدیک وہ غلط ہے تو نگار کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے تردیدی جوابات کو من و عن شایع کر دینے کا وعدہ کرتا ہوں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر ان کے جوابات سے مجھے تسکین ہو گئی، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کروں گا — ورنہ یوں مجھے ان کے مرتد و ملحد کہنے کی پرواہ نہیں ہے، میرا اور میرے عقاید کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیت کیا ہے۔

وکفیٰ باللہ شہیدا!

جذبات بھاشا

کا جدید اڈیشن۔ کاغذ و کتابت نہایت نفیس۔ قیمت بارہ آنہ۔ رعایتی قیمت ۹؍

منیجر نگار لکھنؤ

دو منظر

پنگھٹ کی صبح :

ٹھنڈی ہوا، خموش فضا، بھاپ کا دھواں جاڑے کی رُت، بہار کے دن، صبح کا سماں
لہروں پہ تیرتی ہے حبابوں کی کہکشاں موجوں سے کھیلتی ہیں درختوں کی ڈالیاں
آئی ہوا تو اوس کے موتی ڈھلک گئے،
سرسبز پتّیوں کے پیالے چھلک گئے

آئی کرن نگاہ کے پَر تولتی ہوئی، کُہرے کی ہر لطیف گرہ کھولتی ہوئی،
شبنم کے تابناک گہر رولتی ہوئی، پانی میں روشنی کی شکر گھولتی ہوئی
موجوں کی بیقرار جبینیں چمک گئیں،
وہ جوش کیف ہے کہ ہوائیں بہک گئیں

اشنان کرنے آئی ہے لڑکی کسان کی کاندھے پہ ایک ملگجی دھوتی پڑی ہوئی
ندّی کے پاس جاکے جو انگڑائی اُس نے لی ملاّح کے بھی ہاتھ سے پتوار چھٹ گئی
موجوں نے بڑھ کے اُس کو گلے سے لگا لیا،
شاعر نے بھی نگاہ کو اپنی جھکالیا،

پنگھٹ کی شام :

پیڑوں کی چھاؤں، ریت کے ذرے، شفق کی ضو ساحل کو چومتی ہوئیں موجیں بہ طرزِ نو
خورشید کے چراغ کی بجھتی ہوئی سی لو بربط سا چھیڑتی ہوئی ندّی کی تیز رَو
موجوں کے جزر و مد میں عجب اہتمام ہے،
فردوس کی سحر ہے کہ پنگھٹ کی شام ہے

پھیلی ہوئیں جھکے ہوئے پیڑوں کی ڈالیاں دریا کی سطح بن گئی سایہ کا آسماں،
جاتا نہیں ہے ایک بھی نظارہ رائگاں گاؤں سے آرہی ہیں کسانوں کی لڑکیاں
مٹی کی گاگروں کو سروں پر لئے ہوئے
مستی کی تیز تیز شرابیں پیئے ہوئے

چڑھتا ہوا شباب، مکمل جوانیاں،
موضوعِ حسن و عشق، مجسم کہانیاں
تہذیب عہدِ رفتہ کی زندہ نشانیاں
کھیتوں کی شاہزادیاں، گاؤں کی رانیاں
آتے ہی اُن کے منظرِ ساحل بدل گیا،
ماحول حسن و کیف کے سانچے میں ڈھل گیا

ماہر القادری

رات کی دیوی

نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے
پلکیں جھکی جھکی ہوئی نیندوں کے بوجھ سے
ہونٹوں پہ خامشی سی درختوں کی چھاؤں کی
سونی جبیں پہ سوئی ہوئی بستیوں کا حال
آنکھیں خمار و خواب کے جادو لئے ہوئے
انگشت خوابناک میں ذوقِ گناہ کے
سانسوں کے دھیمے ساز میں خاموشیوں کی لَے
بوسوں کے عطر بیز ترنم کی گرمیاں،
دھڑکن میں دل کی راز کی باتوں کی خامشی
نیندوں کے ابر تار میں کھویا ہوا جمال،
آہستہ پا رواں ہیں افق پر خیال کے
سایوں کے کاروان جلو میں لئے ہوئے

شانہ پہ کاکلوں کو پریشاں کئے ہوئے
دامن میں جگنوؤں کے جلائے ہوئے دئے
وہ لوریاں سی چال میں آہستہ پاؤں کی
دھندلا ہٹوں کے ابر میں کھوئے ہوئے سے گال
ہر ہر نگاہ تیز سی صہبا پیئے ہوئے
مبہم سے کچھ حسین اشارے چھپے ہوئے
سنسان جنگلوں کے مسافر کے دل کا بھے
فرقت زدہ حسینہ کی بیتاب ہچکیاں
جسموں کا اتصال وہ سانسوں کی راگنی،
اوڑھے ہوئے حسین ستاروں کا ایک شال
ماضی کے خوابہائے پریشاں کے قافلے
دھندلے، سکوں فروش، مسلسل، خموش سے

نکلی وہ شب کی دیوی جھروکے سے شام کے

طفیل احمد خاں سلطانپوری

نازی سپاہی

جوش ملیح آبادی

ہم نشیں! آ دیکھ میرے ساتھ میں دیکھوں جہاں
دیکھ یونیفارم میں وہ ایک فوجی نوجواں
دیکھ کتنے صاف و روشن ہیں ٹیونک کے بٹن
شارٹ پر ڈالی ہے اس نے کس قدر باکی شکن
دیکھ اس کے بوٹ پر پالش ہے کتنی دل فروز
پٹیوں پر کتنی خوبی سے الٹ رکھے ہیں ہوز
دیکھ کتنی کس کے یہ تھامے ہوئے ہے رائفل
اس کے بازو ہو نہیں سکتے کسی صورت سے شل
بے حس و حرکت کھڑا ہے ایڑیوں کو جوڑ کر
ہر نظر اس کی گزر جائے گی پتھر توڑ کر
کس نئے انداز سے سینے کو ہے تانے ہوئے
سر کو ہے سیدھا کئے، ٹھوڑی کو ہے بھینچے ہوئے
آہنی قوت سے اس نے داب رکھی ہے زمیں
آندھیوں میں یہ جگہ سے اپنی ہل سکتا نہیں
مارچ کرتے وقت دائیں ہاتھ سے تھامے سلنگ
عزم سے بڑھتا ہے خالی ہاتھ کو دے کر سوئنگ
دبدبے سے اس کے گھبراتے ہیں سب پیر و جواں
راہ دیدیتے ہیں ہٹ کر راستے سے کارواں
گرمیاں سینے میں دل میں ہے شجاعت کا سرور
حوصلوں سے سرخ چہرہ، عزم سے آنکھوں میں نور
یہ محافظ بن کر اٹھا تھا کبھی تہذیب کا
یہ معالج بن کر آیا تھا کبھی تخریب کا
کیا خبر تھی ہے فرشتہ پیشہ ور جلاد بھی
ضامنِ امن و اماں بن جائیگا صیاد بھی

ریڑھ کی ہڈی پہ کٹ سکتی تھی اس کی زندگی
ذہن اسے دے کر خدا نے ذہن کی توہین کی
عقل کی اس کو ضرورت ہی نہیں تھی عمر بھر،
ناچنا ٹھہرا اسے جب دوسروں کے حکم پر
یہ جتانے کے لئے ہے اپنے افسر کا غلام،
یہ سلامی رائفل پر اس کو دیتا ہے مدام

اس کو کوئی مس نہیں ہے زندگی کے سوز سے
میت پروانہ سے یا شمعِ شب افروز سے
ایک آنسو آنکھ سے اس کی کبھی امڈا نہیں،
ایک شعلہ اس کے سینے میں کبھی بھڑکا نہیں
اس کو تاروں کی چمک میں کیف کچھ ملتا نہیں
آتشیں نغمات سے بھی اس کا دل ہلتا نہیں

پھول کے رومان رنگ و بو سے بے بہرہ ہے یہ
حسن کیا سمجھے گا جب پیدائشی اندھا ہے یہ

سامنے بلور کی مینا ہو یا پھولوں کا جام
مار کر ٹھوکر اسے سب کچھ کچل دینے سے کام

واحد اپنی نوعیت کا ہے یہ حیواں سر بسر
پھینک دیتا ہے یہ انسانوں کی گردن توڑ کر

گن مشینوں سے کئے ہیں اس نے مجبوروں پہ وار
اس نے بینٹ سے کیا معصوم سینوں کو فگار

گیس کی صورت میں اپنے غم ہی غم پھیلائے ہیں
اس نے فاقہ کش نہتوں پر بھی بم برسائے ہیں

بھر گیا انسان سے دل تو تنوع کے لئے
ہڈیوں کے پینے کو اس نے توڑے مقبرے

ناز کرتا ہے یہ بچوں کے گھروندے توڑ کر
لطف لیتا ہے یہ ماؤں کو تڑپتا چھوڑ کر

بھاگتا ہے جب لٹیرا بن کے یہ میدان سے
نوچ لیجاتا ہے گہنے بچیوں کے کان سے

کاش یہ گنتا مری بہنوں کی ٹوٹی چوڑیاں
دیکھتا اے کاش ان کی ساڑیوں کی دھجیاں

کردئے کتنے کتب جانے جلا کر اس نے خاک
کتنی تصویروں کو اسنے کردیا وحشت میں چاک

کتنے شاعر ظلم سے اس کے ہوئے ہیں سوگوار
پاؤں سے کچلے ہیں اس نے اپنے کتنے شاہکار

جانور کی طرح اس نے روند ڈالیں کھیتیاں
اس نے باغوں پر گرائیں بے ضرورت بجلیاں

ہم نشیں! کب تک میں اس کمبخت کا شکوہ کروں؟
لا مجھے پستول دے، میں اسکے گولی مار دوں!

فضل الدین آثر ایم-اے

غزل: خلیل اللہ قریشی

کسی کا آستاں ہے اور میں ہوں
نشاطِ جاوداں ہے اور میں ہوں

زمیں کی گردشوں پر ہے تسلط
شرابِ ارغواں ہے اور میں ہوں

خوشا ساعاتِ رنگینِ محبت
وہ کافر شعر خواں ہے اور میں ہوں

یقینِ عظمتِ کعبہ کے باوصف
بتوں کا آستاں ہے اور میں ہوں

وہ دزدیدہ نظر اور پرسشِ حال
محبت کامراں ہے اور میں ہوں

طلسمِ بےخودی ہے کارفرما
خیالِ دلستاں ہے اور میں ہوں

قدم کی چاپ اور ان کے قدم کی
ستم پرور گماں ہے اور میں ہوں